

چشمِ بے خواب

آسیہ رئیس خان

''یہ ندا، صبح ماجد کے ساتھ آئی ہے۔''

نانی کی آواز پر اس نے بہ دقت تمام سر اٹھا کے دیکھا۔

''السلام علیکم۔'' کچھ الجھی اور سنجیدہ سی لڑکی نے سلام کیا۔ وہ ماجد سے کچھ دفعہ مل چکا تھا مگر یہ نام، شکل اور آواز پہلی بار دیکھ اور سن رہا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''سب اہم چیزیں رکھ لیں؟''نانی نے تعارف کی رسم کے بعد یاد دلایا۔

''جی۔''اس نے گھسیٹ کر بیگ ایک طرف کھڑا کر دیا۔

ماجد اسے دفتر جاتے ہوئے چھوڑ گیا تھا۔نانی نے چند باتیں کر کے اس کا کمرہ دکھا دیا تھا۔ تب سے وہ وہیں تھی۔ جیسے ہی اندازہ ہوا کہ تین افراد کے لیے یہ گھر بہت بڑا ہے تب سے وہ ایک ہی شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے عِصام کی غیر موجودگی میں یہاں رکنا تھا۔ امی نے بھی صاف صاف کچھ نہیں بتایا اور نانی نے بھی صبح سے کوئی کام نہیں کہا تھا۔وہ بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔ بڑی دیر سے وہ نانی اور اس کی آوازیں سن رہی تھی، جسے دیکھا بھی آج ہی تھا کہ نانی نے پکارا اور وہ باہر آئی تھی۔

اسے اور نانی کو جواب دینے کے بعد وہ اب تپائی پر کھلے لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔

''نیوز پیپر، روپا، دودھ۔۔۔ باقی سب کے لفافے آپ کی الماری کے دراز میں ہیں، سب پر نام لکھے ہیں۔''اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔آج اٹھائیس تاریخ تھی۔یکم کو سب کی تنخواہیں اور بل ادا کرنے ہوتے تھے۔

نانی کو دیکھتے ہوئے نظر اس پر گئی اور یاد آ گیا کہ ہدایات تو اسے بھی دینا تھیں۔

''آپ آئیں۔''وہ کھڑا ہوا۔اس کا رخ باورچی خانے کی سمت تھا۔اس نے نانی کو دیکھا جنھوں نے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔

''اس کیبنٹ میں آپ کو سب مل جائے گا۔''اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔

''یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ماہ نور عام طور پر ٹفن میں لے جاتی ہیں، ایزی ہیں پھر بھی ریسپی چاہیے تو یوٹیوب پر سب مل جائے گی، ماہ نور کو بھی سب پتہ ہے اسی سے پوچھ لیجیے گا۔۔۔ سیٹرڈے سنڈے آف ہوتا ہے، ہوم ورک کے لیے اس کی ہیلپ کرنا ہوتی ہے اور اس سے ہوم ورک مکمل کروانا ٹاسک ہے۔'' وہ آخر نانی کی اسی بات پر مانا تھا کہ وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔

''آپ کو کچھ پوچھنا ہو تو اینی ٹائم مجھے کال کیجیے گا، ٹیکسٹ نہیں کال۔۔۔'' پاس آکر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ ہونق اسے دیکھنے لگی۔

''فون۔'' عِصام نے پھیلے ہاتھ کی وجہ بیان کی۔ اس نے گر گر کر لکیروں سے بھر چکی اسکرین والا فون اسے تھما دیا۔

عِصام نے اپنا نمبر نام کے ساتھ محفوظ کیا اور خود کو کال کر کے اس کا نمبر بھی محفوظ کرنے لگا تھا کہ اس کا نام بھول گیا۔ ذرا دیر پہلے سنا تھا لہٰذا پھر سے پوچھنا مناسب نہیں لگا۔ اس کے نزدیک نام یاد رکھنا بھی اخلاقی ذمہ داری تھی۔ بار بار کسی سے پوچھنا کہ سوری بھول گیا، کیا نام بتایا تھا، مقابل کو کم تر گردانا ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ روکے فون پر جھکا تھا۔ لمحہ بھر رک کے اس نے جھکے سر کے ساتھ سوچتے ہوئے صرف نظر اٹھائی اور سامنے کھڑی ندا کی کلائی کی دو سیاہ چوڑیاں نظر آئیں۔ اس کا فون واپس کرتے ہوئے فون میں نام کی جگہ اس نے 'بلیک بینگلز' لکھ دیا تھا۔ اس ذہنی نوٹ کے ساتھ کہ اس کے رابطے کی فہرست میں ایسا کوئی دوسرا نام نہیں تھا۔

''یہ سب میں نے احتیاطاً لکھا ہے۔ آپ چاہیں تو سب کچھ اپنی مرضی سے کر سکتی ہیں بشرط یہ کہ ماہ نور مان جائے۔ آپ پہلے اس کو بتا کر پوچھ لیجیے گا کہ وہ کھائیں گی یا نہیں۔ ''

''جی۔''

''یہ کچن، ماہ نور اور گھر دس دن کے لیے آپ کے حوالے، کارٹ بلانچ !(Carte blanche)''(مکمل اختیار یا کھلی چھوٹ)

آخری لفظ وہ بے اختیار بول گیا تھا کہ اسے چند ایسے لفظ بولنے کی عادت تھی۔

تبھی دور سے شور کی آواز آئی اور وہ تیزی سے باہر نکلا۔ ندا پلٹ کر فریج پر میگنٹ کے نیچے دبے پرچے کو دیکھنے لگی۔ وہاں ماہ نور کو جگانے اور سکول بس کے آنے جانے کے اوقات لکھے تھے۔ ساتھ ناشتے اور ٹفن میں دینے والے 'پکوان' لکھے تھے۔ ابلا انڈہ، دودھ، نٹیلا سینڈوچ، چکن سینڈوچ، میکرونی، نوڈلز، چکن رول۔۔۔ مکمل فہرست پڑھے بغیر وہ واپس ہال میں آگئی جہاں چھے سالہ ماہ نور اسکول سے واپس آگئی تھی۔ اس نے اس گھر کے باقی مکینوں کی طرح اسے بھی کسی تقریب میں دیکھا تھا۔

''صرف دس دن۔'' وہ انگریزی میں اس سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے آپ کی بہت یاد آئے گی۔'' اس کی ٹانگوں سے لپٹی ماہ نور نے بھی انگریزی میں کہا۔

''مجھے بھی۔'' اس نے اسے گود میں اٹھایا۔

تبھی باہر سے ہارن کی آواز آئی۔

''میری اوبر آگئی ہے۔۔۔جب تک میں نہیں ہوں یہ۔۔۔''اس نے ذرا سا رخ بدل کر اسے دیکھا۔ماہ نور بھی متوجہ ہوئی۔فون میں تو جو مرضی لکھ دیا تھا تاہم یہاں ویسے نہیں پکار سکتا تھا۔

''ندا۔''اس کے چہرے سے تذبذب بھانپ کر اس نے اپنا نام بتایا۔

''یس ندا آپی یہاں ہوں گی۔یہ میری جگہ آپ کی ہیلپ کریں گی۔''اس نے اسے نیچے اتارا اور دونوں ہاتھ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چہرہ تھام کر چوما۔

''داد و اور آپی کو تنگ نہیں کرنا۔''

''اوکے۔''اس نے گردن ہلائی۔

اس کا ہاتھ تھامے وہ بیگ کے پاس آیا اور اسے گھسیٹتا باہر نکلا۔ان کے پیچھے نانی بھی تھیں۔وہ دروازے میں ہی رک گئی۔وہ دونوں اسے الوداع کہہ کر گیٹ بند کر کے واپس آئیں تب تک وہ وہیں کھڑی تھی۔

''جاؤ تم کپڑے بدلو تب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔''نانی ماہ نور سے مخاطب تھیں۔

''کھانا میں لگا لیتی ہوں،آپ ماہ نور کو دیکھ لیں۔''

''میں اپنے کام خود کرتی ہوں۔''وہ فخر سے کہتی اپنا بیگ اٹھائے چلی گئی۔

وہ نانی کو منع کر کے خود باورچی خانے میں آئی۔کھانا نانی نے بنایا تھا۔روٹیاں رو پا بنا کر گئی تھی۔

ان دونوں کے آنے تک وہ کھانا میز پر لگا چکی تھی۔ انھوں نے کرسیاں سنبھالیں تب بھی وہ پاس کھڑی رہی۔ ہر گھر کے لوگوں کا برتاؤ مختلف ہوتا تھا۔ آج تک صرف اس کی امی کی دور پرے کی ایک چاچی تھیں، جو اسے کھانے کے لیے ساتھ دستر خوان پر بٹھاتی تھیں۔ باقی کوئی اس کمرے میں کھانا بھجوا دیتا جہاں وہ کسی بیمار کے ساتھ رکی ہوتی یا پھر گھر والوں کے بعد دیگر ملازمین کے ساتھ کھانا ہوتا۔

''آپ بھی بیٹھیں۔'' ماہ نور نے اپنے قریب والی کرسی کے آگے خالی پلیٹ رکھی۔ اس نے نانی کو دیکھا۔ انھوں نے اشارہ کیا، 'بیٹھ جاؤ'

کھانے کے بعد اسے خوش گوار حیرت ہوئی جب ماہ نور بھی نانی کے ساتھ نماز کو کھڑی ہوئی۔

وہ برتن دھونے لگی تھی کہ انھوں نے روک دیا۔

''برتن ایک جگہ اکٹھا کر دو، صبح روپا دھوئے گی۔'' وہ چند دنوں کے لیے تھی اور اس دوران وہ روپا کی عادتیں بگاڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

صبح اس کے آنے کے بعد ہی روپا صاف صفائی اور دیگر کام نمٹا گئی تھی۔

وہ نماز پڑھ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ ڈرائنگ روم کا رقبہ خاصا بڑا تھا۔ کھڑکیوں کی وجہ سے روشنی بھی خاصی تھی۔ اس نے اپنا، نانی اور ماہ نور کا کمرہ دیکھا تھا۔ ان کے علاوہ بھی وہاں مزید کمرے تھے مگر وہ اس کے آگے نہیں گئی تھی۔ داخلی دروازہ کھلا تھا۔ برآمدے کے اوپر چھت تھی اور آگے گیٹ بند تھا۔ وہ باہر آگئی۔ احاطہ بہت بڑا نہیں

تھا۔ وہاں گملے نہیں تھے جو عموماً ایسے مکانوں میں اس نے دیکھے تھے لیکن دیوار کے ساتھ انار، لیموں، جاسونتی اور گلاب کے پودے لگے تھے۔ دیوار سے لگی کیاری کے علاوہ وہاں پکا فرش تھا۔ وہ برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ پیر دور کیے اور اپنے بوسیدہ سے پائنچے دیکھ کر دوبارہ پیر قریب کھینچ لیے تاکہ وہ اڑے اڑے رنگ نظروں سے چھپ جائے۔

''کب تک یہ زندگی؟ کیا ہمیشہ؟'' اس نے سر ذرا سا اونچا کر کے نیلے آسمان کو دیکھا۔

جب بھی خاندان میں کہیں، کسی وجہ سے ایک 'ایکسٹرا' مددگار کی ضرورت ہوتی، سعدیہ کا فون بج اٹھتا تھا۔ کسی کے یہاں ولادت ہوئی ہے، کسی کا آپریشن ہوا ہے، کوئی بیمار ہے، کسی کی کام والی لمبی چھٹی پر گئی ہے، کسی کے یہاں شادی ہے یا کوئی تقریب، انھیں مدد کے لیے بلایا جاتا۔ بدلے میں سعدیہ کی مٹھی میں چند نوٹ ہوتے جو ان کی کوئی اہم ضرورت پوری کر دیا کرتے تھے۔ ماجد گر پڑ کر بی بی اے پاس کرنے کے بعد چند ماہ سے چند ہزار کی نوکری پر لگا تھا۔ اسے باہر کی دنیا اور اپنے بھائی کی فطرت کا اندازہ تھا لیکن سعدیہ نہیں سمجھتی تھیں۔ ماجد ماں سے یہ ہی کہتا اپنی تنخواہ کسی نئے کورس پر یا کسی نئی ڈگری پر خرچ کر رہا ہے جس کے بعد اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو گا یا اچھی نوکری مل جائے گی اور سعدیہ کو بیٹے پر اندھا یقین تھا۔

سعدیہ چوں کہ سلائی کرتی تھیں لہٰذا وہ اپنا کام چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھیں اس لیے دو سال پہلے تک ایسے ہر فون پر وہ رقیہ کو بھیج دیتی تھیں۔ اس کی اسکول کا ناغہ ہوتا مگر چند

پیسوں کے بدلے وہ سبھی کو قبول تھا۔ دبلی پتلی رقیہ بھاگ دوڑ کے سب کام منٹوں میں کر دیا کرتی۔ سب اس سے خوش بھی ہوتے تھے۔ لیکن دو سال پہلے ظریفہ چچی کے یہاں سے فون آیا تو رقیہ نے منع کر دیا کہ وہ نہیں جائے گی۔

''تم ہی سمجھاؤ اسے، اس بار اسپتال اور دوائیوں میں اتنا خرچ ہو گیا ہے، تھوڑی آسانی ہو جائے گی۔ ''سعدیہ نے اسے بہن کو منانے کا فریضہ سونپا۔ وہ اس سے پہلے کئی بار ان کے یہاں جا چکی تھی کہ ان کا مشترکہ خاندان تھا اور اس لحاظ سے کسی نہ کسی وجہ سے ضرورت آن پڑتی تھی۔

جب اس نے رقیہ سے بات کی تو وہ کسی طور جانے تیار نہیں ہوئی۔ وہ اس کے اس قدر خلاف مزاج سخت اور اڑیل رویے پر ٹھٹھکی۔

''اصل وجہ کیا ہے؟ جھوٹ مت بولنا۔''اس نے ہاتھ اٹھا کر پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی۔

''پہلے وعدہ کرو امی سے نہیں کہو گی۔۔۔''وہ بھی نہ نہ کرتے تھک گئی تھی۔

''ہوں۔۔۔ تم بتاؤ۔''

اور اس سے وجہ سننے کے بعد پہلی بار وہ اس کی جگہ خود کسی کے یہاں جانے تیار ہو گئی۔

''لیکن تمھارے ٹیوشن کے بچے؟''

''انھیں رقیہ دیکھ لے گی، میں نے اسے سب سمجھا دیا ہے اور بچوں کو بھی۔''

اس کے بعد سے اس نے رقیہ کو پھر کہیں جانے نہیں دیا۔ ویسے بھی وہ پڑھ رہی تھی سو یہ بہانہ بھی کام آ گیا۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟'' ماہ نور کی آواز پر وہ چونکی۔

''آپ کا ویٹ کر رہی تھی۔'' اس نے پلٹ کر نانی کے دروازے کو دیکھا۔

''نانی اب سوتی ہیں۔'' ماہ نور کی بات سن کر وہ مسکرائی۔

''اور آپ کیا کرتی ہیں؟''

''کبھی ٹی وی دیکھتی ہوں، کبھی ہوم ورک، ڈرائنگ اور کبھی سو جاتی ہوں۔''

''ابھی کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

ماہ نور اسے اکیلے کھیلے جانے والے گیم کا بتانے لگی۔ اس کے انداز سے ندا کو لگا کہ وہ پہلے سے اس کی آمد اور مقصد سے آگاہ تھی۔

اس نے باقی اہم چیزیں ماہ نور سے ہی پوچھ لیں۔ ہوم ورک کب کرنا ہوتا ہے، صبح ناشتے میں اور ٹفن میں اسے کیا چاہیے، یونیفارم دھونا یا استری کرنا تو نہیں ہے، بیگ ٹائم ٹیبل کے مطابق وہ خود تیار کرتی ہے یا یہ اسے کرنا ہو گا۔

اس سے قبل وہ روحی بھابھی کے یہاں تیسرے بچے کی ولادت پر گئی تھی۔ تب اس کا کام ان کے دو بڑے بچوں کو صبح تیار کروا کر ناشتہ کھلا کر، ٹفن دے کر اسکول روانہ کرنا ہی تھا۔ چوں کہ وہاں میاں بیوی اور بچے ہی تھے اس لیے بھی آسانی تھی جیسے یہاں۔

اصل امتحان اس وقت ہوتا جب کسی لمبے چوڑے مشترکہ خاندان میں رہنا پڑتا۔

رات کا کھانا نانی نے ہی بنایا۔ وہ ان کی مدد کے لیے موجود تھی۔ باورچی خانے میں قدرے اونچا اسٹول تھا، وہ اس پر بیٹھ کر پکا رہی تھیں۔ اس نے تبھی ان سے کہہ دیا کہ جب تک وہ موجود ہے، وہ آرام کریں پکانا وہ دیکھ لے گی۔

رات وہ اسے بستر میں لٹا اور اوڑھا کر باہر نکل رہی تھی کہ فون بج اٹھا۔

اس نے عِصام کالنگ لکھا دیکھ کر فون سیدھا ماہ نور کو تھما دیا۔

ماہ نور نے دن بھر کی روداد سنا کر اس سے جلد آنے کی گزارش کر کے رکھ دیا۔

☆☆☆☆

اگلی صبح وہ الارم کی آواز پر اٹھ گئی۔ نماز پڑھ کر کچھ دیر باہر ٹہلتی رہی پھر باورچی خانے میں آ کر آج کیا پکانا طے کر کے ضروری اشیاء نکال کر کاؤنٹر پر رکھیں۔ چائے رکھی ہی تھی کہ فون میں الارم بجا اور وہ ماہ نور کو جگانے اس کے کمرے میں آئی۔ وہ تھوڑی آنا کانی کرنے کے بعد اٹھ گئی۔

''آپ جائیں میں ریڈی ہو جاؤں گی۔'' وہ برش کر کے باہر آئی اور ندا کو وہیں بیٹھے دیکھ کر کہا۔ تبھی نانی دروازے میں نمودار ہوئیں۔ وہ اسے نہلانے آئی تھیں۔ وہ دونوں کو چھوڑ کر واپس آئی اور ناشتہ بنایا۔ ساتھ ٹفن بھی۔

اسے ایک دن لگا سب کچھ سمجھنے میں۔اس کے بعد اس نے نانی سے ماہ نور کو نہلانے والا کام بھی لے لیا۔

اس دوران اس نے ایک بار بھی عِصام سے بات نہیں کی۔اس کی کال آتی اور وہ فون ماہ نور کو تھما دیتی۔اس نے اول دن سے ہی سمجھ لیا تھا کہ کام سے کام رکھنے میں ہی عافیت ہے۔دو منٹ کی غفلت اسے بھاری پڑ سکتی تھی۔

دس دن مکمل ہوتے ہوتے وہ ماہ نور سے بڑی متاثر ہو گئی تھی۔اس سے دوستی بھی ہو گئی تھی۔اس نے اس عمر کے کئی بچوں کو قریب سے دیکھا تھا، کوئی بھی ماہ نور کی طرح' منظم' نہیں تھا۔اس نے اپنے آس پاس ہمیشہ جو دیکھا وہ ہی سیکھ لیا تھا۔

پڑھائی میں لیکن اسے بار بار کام کی طرف لے جانا پڑتا کہ اسکول میں ہوئی ساری باتیں اسے اس دوران ہی یاد آتی تھیں۔ کھانے اور پڑھنے میں ٹال مٹول کرتی، بہانے بناتی لیکن بد تمیزی نہیں کرتی تھی۔اکثر اپنے بڑوں کو دیکھ کر ہی بچے سمجھ لیتے تھے کہ اس لڑکی کا کیا مقام ہے اور پھر وہ بھی اسی انداز میں بات کرنے لگتے تھے۔یہاں نانی کے انداز مالکانہ ہی تھے لیکن وہ بات کرتے ہوئے خیال رکھتی تھیں۔ان کے لہجے میں تحکم، تنفر اور تذلیل نہیں ہوتی تھی۔شاید اسی لیے ماہ نور کا رویہ بھی اس کے ساتھ شروع سے دوستانہ تھا۔شام میں کچھ دیر پڑوس سے دو سہیلیاں اس کے ساتھ کھیلنے آتی تھیں بس۔اس کے علاوہ وہ اسکول کے بعد گھر میں ہی رہتی تھی۔

دس دن بعد وہ لوٹا تو اسے امید تھی کہ ماہ نور گیٹ کے پاس اس کی منتظر ہو گی لیکن خلاف توقع وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے اپنی چابی سے دروازہ کھولا، سامان ڈرائنگ روم میں رکھنے کے بعد اس نے نانی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ سو رہی تھیں۔

''کسی کو میرا انتظار ہی نہیں! ''سب کو اس کے آنے کا دن اور وقت معلوم تھا۔

وہ ماہ نور کے کمرے میں جاتے ہوئے یہ امید کر رہا تھا کہ وہ بھی سو رہی ہو گی لیکن دروازے کے قریب ہی اندر سے آتی آوازوں پر اسے یاد آگیا کہ گھر میں تیسرا فرد بھی ہے۔

''آپ لکی ہیں یا اچھی پلیئر ہیں؟'' ماہ نور کے انداز اور باتیں ہمیشہ اپنی عمر سے آگے والی ہوتی تھیں۔ وہ مسکرا دیا۔ دبے قدم آگے بڑھتے ہوئے وہ دروازے میں ہی رک گیا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے؟'' ماہ نور فرش پر اوندھی لیٹی تھی سامنے لڈو کی بساط تھی، ندا اس کے سامنے بیٹھی تھی، یعنی دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔

''دونوں!'' ماہ نور نے کہا۔ ندا ہنس دی۔

'' بچپن سے اب تک میں اور میری سسٹر نے یہ ہی ایک گیم کھیلا ہے۔ آپ میرے اتنی بڑی ہو جائیں پھر کھیلتے کھیلتے آپ بھی اچھی پلیئر بن جائیں گی۔''

''مینس (مطلب) مجھے بھی یہ کھیلتے رہنا پڑے گا۔۔۔ لیکن کس کے ساتھ؟''

''میرے ساتھ۔'' وہ کہتے ہوئے اندر آیا۔ ماہ نور جھٹ اٹھی اور دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ عِصام نے اسے گود میں اٹھایا اور وہ اس کے گلے لگ گئی۔

''مسڈیو میری جان!'' عِصام نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے دن بعد اس کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے وہ سرگوشی میں گویا خود سے ہی کہہ رہا تھا۔ ہر شب سونے سے پہلے اسے یاد آتا کہ اسے سلانے کے بعد وہ جو اس کا سر چومتا تھا تو اس معمول کا ایک رکن ماہ نور کے شیمپو کی خوشبو بھی تھی۔ معمول کی ایسی کتنی معمولی باتیں دور جانے پر اپنی اہمیت باور کرواتی ہیں۔

ندا فرش کی چیزیں اٹھا کر میز پر رکھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

''آپ میرے لیے کیا لائے ہیں؟'' ماہ نور نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''چلو دیکھتے ہیں۔'' باہر نکلنے سے پہلے وہ ذرا سا مڑا۔

''تھینک یو۔'' اس کا مخاطب ندا تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اس مصنوعی تبسم کا مطلب تھا' مینشن ناٹ!'

وہ ڈرائنگ روم میں بیگ کھول کر بیٹھ گئے۔ ان کا شور سن کر نانی بھی آ گئیں۔ اتنے دنوں میں اتنی تبدیلی آ چکی تھی کہ وہ خود ہی باورچی خانے میں چلی گئی۔

چائے رکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ چار بج رہے ہیں، ہو سکتا ہے اس نے دوپہر کا کھانا ہی نہ کھایا ہو۔ وہ چولھے کی آنچ کم کر کے واپس آئی۔

''چائے بناؤں یا کھانا لگاؤں؟'' اس نے نانی کے پاس جھک کر دھیرے سے پوچھا۔

''کھانا کھالیا تھا یا کھاؤ گے ؟''انھوں نے عِصام کو دیکھا۔

''کھانا۔۔۔بہت بھوک لگی ہے۔''اس نے ماہ نور کو نیا بورڈ گیم سمجھانے کے دوران ذرا سا رک کر جواب دیا۔

اس نے واپس آکر چائے اتار کر ایک طرف رکھی اور کھانا گرم کرنے لگی۔کچھ دیر بعد وہ ماہ نور اور نانی کے ساتھ وہیں موجود تھا۔

''نیو گیم آپی !''ماہ نور پورے جوش میں تھی۔

''مزہ آئے گا۔''

''آپی اب گھر جائے گی بیٹا۔''نانی نے نرمی سے اسے اطلاع دی۔

''کیوں ؟''اس کا منہ اتر گیا۔

کرسی سنبھال کر پلیٹ میں قیمہ میتھی نکالتے ہوئے اس نے ماہ نور کو دیکھا پھر ندا کو جو اب مڑ کر چولھے پر رکھی چائے کی پتیلی پر نظر جما چکی تھی۔

''کیوں کہ وہ اتنے وقت کے لیے ہی آئی تھیں۔اب عِصام آگیا ہے۔۔۔تم کھاؤ رک کیوں گئے۔''

''فٹ بال ٹیم کا سلیکشن ہو گیا؟ایگزام کا ٹائم ٹیبل ملا؟''اس نے ماہ نور کی صورت دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔

ماہ نور کو جانے کس نے سمجھایا تھا لیکن جیسا وہ ڈر رہی تھی کہ اس کے جاتے وقت وہ رونے لگے گی، ویسا نہیں ہوا۔ وہ اداس تھی مگر مسکرا کر اسے وداع کیا تھا۔ ماجد اسے لینے آیا تھا۔ نانی نے پوچھا تھا اور اس نے وہی جواب دیا جو ہمیشہ کہتی تھی۔

''وہ آپ امی کے نمبر پر بھیج دیں۔''

گھر واپس آکر وہی زندگی تھی۔ ٹیوشن والے بچے اسے دیکھ کر خوش تھے اور رقیہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اس کے بچے اس سے سنبھلتے نہیں تھے۔

اس نے پوچھا نہیں کہ نانی نے کتنی رقم دی۔ ویسے بھی یہ کوئی باقاعدہ ملازمت نہیں ہوتی تھی کہ پہلے سے کچھ طے کیا جاتا۔ یہاں اس نے کتنی مشقت کی، کتنا کام کیا اس کی اہمیت نہیں تھی۔ دینے والے کی مرضی، اس کا بڑا دل، اور خوشی ہوتی کہ وہ جو بھی دے دے۔ کبھی کبھی تو بڑی مایوسی ہوتی تھی۔

لیکن جب اس نے ماجد اور امی کی بات سنی کہ اس کے کورس کی فیس پوری ادا ہو گئی ہے تو اسے یقین نہیں آیا۔ ایک تو ماجد کے واقعی کورس کرنے کا دوسرا اتنی رقم کا۔

''آپ نے اپنے جمع کیے پیسے بھی ڈال کر دیے اسے؟''

''نہیں، عِصام نے اتنے ہی بھیجے تھے۔''

اور اسے یاد آیا واپسی کے وقت جب وہ اپنا بیگ لیے آئی تھی تو وہ اور ماجد اسی کورس کی بات کر رہے تھے۔

''کیا ماجد نے جان بوجھ کر یہ ذکر کیا تھا؟ یا اس نے سیدھا فیس کی بات کی تھی؟''

وہ ماجد سے پوچھتی تو ان میں کم سے کم بحث ہوتی اور زیادہ سے زیادہ شدید قسم کی لڑائی جو سعدیہ کو اختلاج میں مبتلا کر دیتی لہٰذا اس نے ماجد سے پوچھا نہیں۔ اس کی ماں ساری مشقتیں اور تنگی اسی ایک آس میں ہنسی خوشی سہہ رہی تھیں کہ ان کا بیٹا جلد ایک نئی دنیا ان کے ارد گرد بنانے والا ہے جس میں خوشیاں، سہولت اور فراخی کی شکل میں بکھری ہوں گی اور ماں سے امید کا یہ تکیہ چھیننا نہیں چاہتی تھی، دن بھر سلائی مشین چلانے کے بعد جس پر سر رکھ کر وہ سکون سے سو جاتی تھیں۔

☆☆☆☆

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کے کان بھی باہر لگے تھے۔ کچھ آوازیں ابھریں لیکن وہ جان نہ سکی کہ کون آیا ہے۔

''ندا!'' سعدیہ نے اسے پکارا اور وہ بلا سوچے سمجھے آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ لے کر دروازے میں آئی اور سامنے عِصام اور ماہ نور کو دیکھ کر حیرت سے ہونق بن گئی۔

''السلام علیکم۔'' ماہ نور نے چہکتے ہوئے سلام کیا۔

''و۔۔۔ وعلیکم السلام۔'' نظر ساتھ کھڑی امی پر پڑی اور ان کی نظر کے تعاقب میں اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو غڑاپ سے اندر غائب ہو گئی۔

''آپ دونوں اندر آیئے۔'' سعدیہ ان سے کہہ رہی تھیں۔

''میں آپی کے پاس جاؤں؟'' ماہ نور نے پوچھا۔ وہ جو تیزی سے ہاتھ پر لگا آٹا الگ کر رہی تھی ایک لمحے کو رکی اور ہاتھ صاف کرنے کی بجائے پھر سے آٹا گوندھنے لگی۔ اس دفعہ ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

''وہ بھی آجائے گی۔۔۔ کچن میں گرمی بہت ہے۔'' سعدیہ نے جھجھکتے ہوئے اسے روکنا چاہا۔

''ہم اندر ویٹ کرتے ہیں، آپ کی آپی آجائیں گی۔'' عِصام نے اس کا ہاتھ تھام لیا، مبادا وہ بھاگ کر اس کے پاس نہ پہنچ جائے۔

ان کی آوازیں معدوم ہوئیں اور اس نے جلدی جلدی آٹا گوندھا اور ہاتھ دھو کر دوپٹا اٹھایا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی اُس گھر سے ملنے اس گھر تک آیا تھا جہاں وہ چند دن کسی کام کے لیے رہ آئی تھی۔ ورنہ بلانا ہوتا یا کوئی اور بات، سب فون پر ہوتا تھا۔

ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتی باہر نکلی ہی تھی کہ یاد آیا وہ مہمان ہیں۔ واپس اندر آئی اور کانچ کے گلاس نکال کر دھوئے، ان میں پانی بھرا اور ٹرے میں رکھ کر اس کمرے میں آئی جو کبھی نہ آنے والے مہمانوں کے لیے ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رکھا جاتا تھا۔ کسی کے گھر سے ملے پرانے صوفے پر سعدیہ کے سلائی کردہ کور اور کشن تھے۔ سامنے پرانی تپائی جس کی عمر اور صحت چھپانے بھی اس کی امی کا ہنر کام آیا تھا۔ ایک طرف جھولتی میز پر ان دونوں کی کتابیں اور ماجد کا سامان تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف الماری کھڑی

تھی اور کونے میں ایک کے اندر دوسری پھنسا کر رکھی جانے والی پلاسٹک کی کرسیوں سے ایک نکال کر صوفے کے سامنے رکھ کر سعدیہ اس پر بیٹھی تھیں۔

''ماہ نور کو تمھاری یاد آ رہی تھی۔'' اسے دیکھتے ہی انھوں نے کہا۔

اس نے مسکرا کر ماہ نور کو دیکھا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔

سعدیہ نے کھڑے ہو کر گلاس عِصام کو تھمایا اور دوسرا ماہ نور کو۔

''تم بیٹھو۔ میں ادھر دیکھتی ہوں۔'' وہ اسے کہہ کر چلی گئیں۔

''آپ کو میری یاد نہیں آئی؟'' دو گھونٹ لے کر اس نے سوال کیا۔

''آئی نا۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''جھوٹ! مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں جیسے میں آئی ہوں؟'' وہ لہرا کر سیدھی ہوئی اور عِصام نے اپنا گلاس رکھنے کے بعد اس کے ہاتھ میں ڈول رہا گلاس لے کر میز پر رکھا۔

''میں دیکھ رہی تھی، آپ کو کتنے دن بعد میری یاد آتی ہے۔'' ندا مسکرائی۔

''دیکھا! اس لیے کہہ رہی تھی آپ سے مجھے لے کر چلیں آپی کے پاس۔'' عِصام پر خفاسی نظر ڈالنے کے بعد اس نے ندا کو دیکھا اور پھر واپس عِصام کو۔

''اب آپ ہی انھیں بتائیں مجھے کب سے ان کی یاد آ رہی تھی۔''

''آپ گئیں اس کے اگلے روز ہی ماہ نور کو آپ سے ملنے آنا تھا۔'' عِصام نے اسے دیکھا اور ماہ نور کی تمنا پوری کی۔ وہ مسکرا کر پھر ماہ نور کو دیکھنے لگی۔

''آپ کے ایگزامز تھے نا؟'' اسے یاد آیا۔

''ختم ہو گئے ہیں تب ہی تو ہم آئے ہیں۔'' اس نے پھر جتاتی، ناراض سی نظروں سے عِصام کو دیکھا۔

''پھر تو بالکل ٹھیک کیا۔ ایگزامز کے بیچ یہاں آ کر آپ تھک جاتیں، ڈسٹریکٹ ہو جاتیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ اس بات کی تردید کرتی، ندا نے رکے بغیر اگلا سوال پوچھا۔

''ایگزامز کیسے ہوئے؟''

''اوکے اوکے۔'' اس نے منہ بنایا۔ وہ اوسط درجے کی طالبہ تھی، اتنا تو وہ بھی جان گئی تھی۔

وہ ظاہر نہ ہو اس طرح کمرے اور گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اتنے دنوں میں ماہ نور کی ہر تان آپی پر ٹوٹ رہی تھی۔ وہ اس کے جواب پر چپ ہو جاتی لیکن پھر ذرا وقت بعد نیا سوال موجود ہوتا۔

''وہ کیوں چلی گئیں؟''

''وہ مہمان تھیں، کچھ دن کے لیے آئی تھیں اس لیے۔''

''وہ دوبارہ کچھ دن کے لیے نہیں آ سکتیں؟''

''آ سکتی ہیں مگر ابھی ان کی ضرورت نہیں۔''

''وہ ضرورت کے بغیر نہیں آ سکتیں؟''

''نہیں۔''

''وہ ہمیشہ یہاں نہیں رہ سکتیں؟''

''نہیں۔ ہر کوئی اپنے گھر میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔''

''کیا ہم ان سے ملنے جا سکتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''کب؟''

اور اب وہ اس کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ نانی اس کے خلاف تھیں کہ وہ ملنے جائیں پھر بھی وہ آ گئے تھے۔

سعدیہ ٹرے لیے اندر آئیں تب وہ چونکا۔ ماہ نور اور اس کی جانے کیا بات چل رہی تھی۔

''لو بیٹا۔'' انھوں نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے شکریے کے ساتھ تھام لیا۔ دو چھوٹی طشتریوں میں بسکٹ تھے۔ ایک انھوں نے اٹھا کر اس کے آگے رکھی اور ایک ماہ نور کے آگے۔

''آپ بھی چائے پیتی ہیں؟'' انھوں نے پوچھا اور ماہ نور نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بسکٹ اٹھا لیا۔ عِصام ایک جملے کے بعد خاموش ہی تھا۔

''آپ آپی کو کچھ دن کے لیے ہمارے گھر نہیں بھیج سکتیں؟'' اب کے اس نے سعدیہ سے پوچھا۔

''اگر کوئی کام ہو تو ضرور بیٹا لیکن اس کے علاوہ۔۔۔ مشکل ہے کیوں کہ ٹیوشن کے بچے ندا کے علاوہ اور کسی سے کنٹرول نہیں ہوتے ہیں۔''

''وہ کچھ دیر کے لیے تو آسکتی ہیں نا؟''

''ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔'' سعدیہ نے اسے دیکھا۔

وہ تو ان دونوں کو دروازے پر دیکھ کر ہی ششدر تھیں۔ انھیں لگا تھا وہ دراصل ماہ نور کے بہانے شاید پھر ندا کو کچھ دن کے لیے گھر بھیجنے کی بات کرنے آیا ہے۔

ندا نے ان کے عام سے سوالوں کے جواب دیے تھے جو وہ کہیں سے بھی آنے کے بعد پوچھتی تھیں۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ماہ نور سے اس کی اتنی گہری دوستی ہو گئی ہے کہ وہ ملنے آجائے گی۔

''یہ دروازے کے پاس کس نے کار کھڑی کر دی امی۔۔۔ ذرا دیکھیں باہر جا کر اور۔۔۔'' رقیہ دروازے سے بولتی اندر آئی اور ان دونوں کو دیکھ کر زبان بند ہو گئی۔

مہمانوں کا حلیہ ہی کافی تھا بتانے کہ کار کس نے کھڑی کی ہے۔ اس نے شرمندگی مٹانے منمناتے ہوئے سلام کیا۔

عِصام نے اتنی دھیمی آواز میں جواب دیا کہ کوئی سن نہیں سکا۔

''یہ آپ کی سسٹر ہیں؟ جن کے ساتھ آپ لڈو کھیل کر چیمپئن بنی ہیں؟'' اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''یہ میری چھوٹی بیٹی رقیہ ہے۔۔۔یہ ماہ نور اور یہ عِصام ہیں۔''سعدیہ نے تعارف کروایا۔بوکھلائی سٹپٹائی رقیہ نے ایک بار پھر سلام کر دیا۔پھر خجل سی اس کے پاس آئی۔

''یہ تمھارا لیس کا سامان اور یہ پین۔''وہ سب اس کی گود میں ڈھیر کر کے باہر نکل گئی۔

''آپ دونوں کھانا کھا کر جائیں۔''سعدیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔یہ ظہرانے کا وقت ہی تھا۔

''نہیں،آپ یہ سب نہ کریں مجھے ماہ نور کے بال کٹوانے جانا ہے اور بھی دو تین کام ہیں،آپ کا گھر پہلے تھا اس لیے ابھی سب کام باقی ہیں۔''اس نے اٹھنے سے پہلے ماہ نور کو دیکھا۔

''اب چلیں بیٹا۔''

''مجھے آپی کا بنایا پنیر پراٹھا کھانا تھا۔''اس نئی فرمائش پر وہ شرمندہ ہو گیا۔ماہ نور بے دھڑک جو دل میں آئے وہ کہنے کی عادی تھی پھر بھی یہ سب پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔

''ارے بیٹا تو رکو۔۔۔''سعدیہ بول ہی رہی تھیں کہ اس نے ماہ نور کا ہاتھ تھام کر بات قطع کی۔

''نہیں آنٹی۔۔۔پھر کسی دن۔۔۔آج دیر ہو رہی ہے۔''اس نے مقدور بھر کوشش کی تھی کہ اس کا لہجہ نرم رہے۔

''بیٹا کسی اور دن آج نہیں۔ گھر پر نانی بھی اکیلی ہیں۔''اس نے ماہ نور سے کہا۔ ماہ نور کی صورت مرجھا گئی مگر سر بھی اقرار میں ہل گیا۔

ماہ نور کی وجہ سے اسے بھی دروازے تک جانا پڑا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹی اور رقیہ باہر آئی۔

''یہ یہاں کیسے؟''

''بتایا تو تھا تمھیں ماہ نور پیاری بچی ہے، اس سے دوستی ہو گئی تھی۔''

''وہ دوستی اب بھی چل رہی ہے، یہ کہاں بتایا تھا۔''لوگ انھیں ضرورت کے وقت ہی یاد کرتے تھے۔

''یہ مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔''اس نے گہرا سانس لیا۔ پیچھے دروازے پر ہوئی دستک پر دونوں نے ٹھٹھک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''سعدیہ! کھولو بھی۔''خالہ کی آواز سن کر دونوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اب رات تک فرصت تھی۔ خالہ بہو بیٹا کی شکایتوں کا انبار جمع کر کے سعدیہ کے سامنے ڈھیر کرنے ہی آتی تھیں۔

اس نے پلٹ کے دروازہ کھول دیا۔

☆☆☆☆

کبھی کسی طرف سے ایسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا جیسی ماہ نور نے دکھائی تھی۔ نانی کے لیے دیے رویے کے باوجود ماہ نور کو نظر انداز کرنے دل تیار نہیں تھا۔ پڑوسن کے لیے کروشیا کی لیس بناتے ہوئے اس نے ماہ نور کے لیے بھی ایک لوڈو کے ساز و سامان رکھنے کے لیے ننھا سا بٹوہ بنالیا پھر ایک اور کچھ مختلف وضع کا جو پینسل اور دیگر چیزوں کو سنبھال سکتا تھا، وہ بھی بن گیا۔ جانے سے پہلے اس نے اس کا فرمائشی پراٹھا بھی بنالیا اور پھر سعدیہ سے کہہ کر ماہ نور سے ملنے آگئی لیکن اب گیٹ پر اطلاعی گھنٹی بجانے کے بعد سوچ رہی تھی کہ پہلے نانی کو فون کر کے اطلاع دے دیتی تو اچھا ہوتا۔ اتنی دیر میں دو دفعہ بیل کے بعد بھی ابھی تک گیٹ نہیں کھلا تھا۔ وہ واپسی کا سوچ ہی رہی تھی کہ دوسری جانب آہٹ ہوئی۔

"شکر ہے۔"

گیٹ عِصام نے کھولا تھا۔

"سوری۔ آیئے۔" اس نے دیری سے گیٹ کھولنے کی معذرت کرتے ہوئے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

پہلے وہ ڈرائنگ روم میں آئی، اس کے پیچھے عِصام تھا۔

"بیٹھیں پلیز۔" وہ یونہی کھڑی تھی۔

وہ راہداری کی جانب دیکھ رہی تھی جہاں سے ماہ نور کو آنا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر سیدھی ہوئی تو عِصام کمرے میں نہیں تھا۔

''نانی کو بلانے گئے ہوں گے۔''

کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں گلاس رکھے حاضر تھا۔اسے اچھا نہیں لگا پھر خیال آیا جتنے کام اس نے ان دس دنوں میں کیے تھے وہ بیشتر عِصام کے ہی کام تھے۔

''ماہ نور کہاں ہے؟''آخر اس نے پوچھ لیا۔

''نانی اور ماہ نور، ظریفہ آنٹی کے گھر گئی ہیں۔''وہ دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے آنے سے پہلے فون کرنا چاہیے تھا۔''اس نے افسوس سے سوچا ہی نہیں بول دیا۔

''میں پوچھ لیتا ہوں انھیں کتنی دیر لگے گی یا انھیں لے آتا ہوں۔''اس نے اپنے پاجامے کی جیب سے فون نکالا۔

''نہیں پلیز، انھیں بلائیں مت۔میں پھر آجاؤں گی۔یہ۔۔۔''اس نے بیگ سے ڈبہ اور بٹوے نکال کر میز پر رکھے۔

''یہ ماہ نور کو دے دیجیے گا۔''اس نے نے میز پر رکھی اشیاء دیکھیں پھر اسے دیکھا۔

''تھینک یو۔ماہ نور بہت خوش ہو گی۔''اس کی سنجیدہ آواز میں واقعی تشکر تھا۔

''میں چلتی ہوں۔''

''دو منٹ رکیں پلیز۔''وہ اسے کہتا اٹھ کر پھر چلا گیا۔

وہ دروازے سے باہر نظر آرہے ادھ کھلے گیٹ کو اس امید پر تکتی رہی کہ شاید نانی اور ماہ نور آجائیں۔

عِصام واپس آیا تو اس بار ٹرے میں کافی کے دو مگ تھے۔ جب وہ میز پر ٹرے رکھنے جھکا تو اس کے نم بال دیکھ کر اسے دیر سے گیٹ کھولنے کی وجہ سمجھ آئی۔ اس نے ایک مگ اس کے آگے رکھا اور دوسرا خود لے کر سابقہ جگہ بیٹھ گیا۔

''اتنی ساری کافی کتنی دیر میں ختم ہو گی؟ کرنے کو کوئی بات بھی نہیں ہے۔۔۔ کاش نانی اور ماہ نور آ جائیں! بے کار ہی آئی آج میں۔۔۔'' وہ سر جھکائے گھونٹ بھر رہی تھی کہ نظر فرش پر پھسلتی عِصام کے پیروں پر رک گئی۔ اس کے سفید گلابی، صاف ستھرے پیر دیکھ کر بے اختیار اس نے اپنے پنجے چوڑے پائنچے کے اندر سمیٹ لیے۔ نظر اٹھائے بنا، زمین پر دھرے پیر ہی ان کے بیچ حائل ٹاٹ اور مخمل کا فرق بتانے کافی تھے۔

''ماجد کا کورس کیسا چل رہا ہے؟'' اچانک عِصام نے پوچھا۔

''جی اچھا۔'' اسے خاک علم تھا جو وہ بتاتی۔ ماجد اور اس کے درمیان کی مساوات کچھ یوں تھی وہ چاہے جتنے پیار اور نرمی سے بات شروع کرتے، اختتام ان کی بحث پر ہی ہوتا تھا۔ اسی وقت عِصام کا فون بجا۔ اس نے اس امید پر نظر اٹھائی کہ کاش ماہ نور ہو لیکن عِصام کی بات سے لگا کوئی دفتری فون تھا۔ اس نے تیزی سے کافی ختم کی اور اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

''میں چلتی ہوں۔'' اس نے کال منقطع کی اور وہ کھڑی ہو گئی۔

''ان سب کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔'' عِصام نے کہا۔

وہ سر ہلا کر باہر آ گئی۔

رات عِصام کے نمبر سے کال آئی تو اس نے مسکرا کر اٹھائی، دوسری طرف حسبِ امید ماہ نور تھی۔

☆☆☆☆

پورے چالیس منٹ بعد سعدیہ نے فون رکھا۔

''کیا کہہ رہی تھیں خالہ؟'' جواب کا اندازہ تھا، پھر بھی رقیہ نے پوچھا۔

''کیا کہے گی! بے چاری کی زندگی بہو نے اجیرن کر رکھی ہے۔ اتنے ارمانوں سے شادی کی تھی اب روز خون کے آنسو روتی ہے۔'' بہن کے لیے ان کا لہجہ بھی دل گیر تھا۔

''اس سے پہلے کس کا فون تھا؟'' بہن کی ہمدردی میں وہ بھی ان کی بہو کی برائیاں شروع نہ کر دیں، اس لیے اس نے یاد دلایا۔ اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے لیس بُن رہے تھے۔

''ظریفہ چچی کا فون تھا۔ شادی ہے، کہہ رہی تھیں کچھ دن کے لیے بیٹی کو بھیج دو۔''

''تیار ہو جاندا!'' اس نے انگلی پر دھاگا لپیٹتے ہوئے دل میں خود سے کہا۔ دھاگا کچھ زیادہ ہی تنگ لپیٹ لیا کہ خون رکتا محسوس ہوا۔ شادی کے گھر میں کوئی مخصوص کام نہیں ہوتا تھا بلکہ جب جو کہا جائے، جہاں ضرورت ہو، جدھر سے آواز آئے وہ سب کرنا

ہوتا۔اس کی بجائے اسے وہ گھر اور کام اچھے لگتے تھے جہاں معلوم ہوتا کہ کیا کرنا ہے۔ ایک تو وہ نہ روایتی ملازم ہوتی نہ روایتی مہمان اس لیے کسی گروہ، کسی محفل کا حصہ بھی نہیں بن پاتی تھی۔کچھ اسے اپنے سے کم سمجھ کر نظرانداز کرتے اور ملازمین ان سے 'بہتر' اور 'اوپر' ہونے کی وجہ سے اکھڑے اکھڑے رہتے۔

''کب بلایا ہے؟''

''ستائیس کی شادی ہے۔اس سے ہفتہ بھر پہلے کہہ رہی تھیں۔''

''اس سے پہلے علینہ کی بھابھی کی لیس پوری کر دینا ورنہ وہ سر کھا جائے گی میرا۔'' رقیہ نے یاد دلایا۔اپنے اس ہنر سے بھی وہ چند پیسے کما لیتی تھی۔

''ہوں۔'' اس کا ذہن الجھا اور سوچیں مضمحل تھیں۔

وہ جس دن جانے کا سوچ رہی تھی، اس سے دو دن پہلے ہی فون آ گیا کہ آج بھیج دو۔ اس دن ماجد کو بھی وقت نہیں تھا۔آخر سعدیہ ہی اسے وہاں چھوڑ آئیں۔

ظریفہ چچی سے ان کا کیا رشتہ ہے، کئی بار سعدیہ نے سمجھایا تھا لیکن اسے یاد نہیں رہتا تھا سوائے اس کے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے اس کی امی کی چچی تھیں یعنی اس کی نانی۔ان کے سارے بیٹے اور ان کی اولادیں ساتھ رہتی تھیں یعنی مشترکہ خاندانی نظام تھا۔

ظریفہ چچی نے اسے دلہن کے ساتھ اس کے کمرے میں رہنے کہا کہ ابٹن شبٹن والی دلہن کو اکیلے چھوڑتے انھیں وہم ستاتے تھے۔دن بھر تو دلہن کا کمرہ بھرا رہتا تھا۔وہ

دوسرے کاموں میں مصروف رہتی صرف سونے کے لیے اس کمرے میں آتی تھی۔ دلہن اپنی مسہری پر سوتی اور وہ نیچے فرش پر بستر لگا کر تھکی سی سو جاتی تھی۔

☆☆☆☆

وہ اسٹور سے کچھ چیزیں نکال کر بڑے سے تھال میں رکھ کر باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی جب اس نے آواز سنی اور اسے لگا وہم ہے مگر رک کر غور کیا تو وہ نانی ہی تھیں۔

''اکیلی آئی ہیں یا ماہ نور بھی ہے؟'' اسے یاد آیا جس دن وہ گھر گئی تھی، تب عِصام نے ظریفہ آنٹی کا نام لیا تھا۔

''اللہ جانے کس کا کس سے کیا رشتہ ہے۔''

اس نے وہاں سامان رکھا ہی تھا کہ باورچی خانے کی نگرانی پر معمور زبیدہ نے اسے ٹرے تھمادی کہ بڑی بیگم کے کمرے میں دے آؤ۔ وہ بھی اسی کے قبیلے سے تھی قابلِ ذکر مہمان نہ ملازم۔ اس لیے اس پر رعب جما کر خود کو اس سے ایک درجہ آگے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی لیکن کبھی اس سے الجھی نہ اسے انکار کیا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

''آپی!''جواب سے پہلے ماہ نور کا نعرہ گونجا۔ دوڑ کے اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی کہ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

ظریفہ چچی نے سوالیہ نظروں سے نانی کو دیکھا۔

''عِصام کچھ دن کے لیے باہر گیا تھا، تب ندا کو بلایا تھا۔''

اس نے ٹرے میز پر رکھی اور ماہ نور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''میں آپی کے ساتھ باہر جاؤں؟''اس نے نانی کو دیکھا۔ نانی نے جواب دینے کی بجائے ظریفہ چچی کو دیکھا، انھوں نے اسے۔

''تمھیں کوئی کام ہے ابھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''جاؤ بیٹا۔''انھوں نے بڑے پیار سے ماہ نور کو دیکھا۔

ماہ نور اس کا ہاتھ پکڑے باہر آئی۔ مہمانوں سے بھرے گھر میں ہنگامے تھے، شور تھا۔ وہ دونوں باہر آ گئیں۔ پراٹھے اور تحائف کے لیے پسندیدگی کے اظہار اور شکریے کے بعد اس کا شکوہ حاضر تھا۔

''آپ اس کے بعد آئیں کیوں نہیں؟''لان میں چلتے ہوئے اس نے منہ بسورا۔

''اس کے بعد وقت ہی نہیں ملا اور پھر اِدھر آ گئی۔''

''اِدھر کیوں آ گئیں؟''

''یہاں میری ضرورت تھی؟''اس نے پیروں کے نیچے دب رہی گھاس کو دیکھا۔

''ضرورت کیا ہوتی ہے؟''

ندارک گئی۔اس نے ماہ نور کا سوال دل میں دہرایا۔

''بولیں ناں؟'' ماہ نور نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

''پتہ نہیں۔آپ بتائیں اسکول میں سب کیسا ہے؟''

''ابھی ویکشنز ہیں۔'' ماہ نور نے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں۔''

وہ چلتے چلتے ایک دم رک گی۔سامنے سائبان کے نیچے کرسیوں پر لڑکے بیٹھے تھے اور سب کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔

''واپس چلتے ہیں۔'' وہ ماہ نور کو لیے پلٹی۔

''ارے کہاں چلیں۔۔۔''

''آؤ آؤ ادھر بھئی۔''

''ارے پلٹ!'' کسی نے سیٹی بجائی۔

اسے صاف آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اسی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ان کے بے باک قہقہے بہت اونچے تھے۔اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔

''ہم یہاں بیٹھتے ہیں۔'' وہ بنگلے کے دائیں جانب سے اوپر جانے والے زینے کے پاس رک گئی۔

''آپ میری فرینڈ کے لیے بھی ایک پاؤچ بنادیں گی پلیز؟'' وہ بیٹھ گئی اور ماہ نور سامنے کھڑی تھی۔

''کیوں نہیں لیکن اس شادی کے بعد۔''

''کب ہے شادی؟'' اس نے بے صبری سے پوچھا۔ اس شادی کے ختم ہونے کا انتظار تو اسے بھی تھا۔

''دو تین دن میں۔''

''اوہ۔۔۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''پھر تین دن کے بعد آپ بنائیں گی؟''

''ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''تھینک یو۔'' ماہ نور نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔

تبھی گیٹ کھلا اور کار اندر آئی۔ ماہ نور کار دیکھتے ہی دوڑ گئی۔ وہ آواز دیتے ہوئے اس کے پیچھے جانے لگی تھی کہ رک گئی۔ یقیناً ماہ نور کار پہچان کر ہی بھاگی تھی۔

کچھ دیر بعد ماہ نور کا ہاتھ تھامے عِصام نظر آیا۔ وہ زینے سے ہٹ کے داخلی دروازے کی سمت بڑھی۔ اسے بھی اب اندر جانا تھا۔

''اندر نانی کو میسج دے دیں پلیز کہ میں آگیا ہوں۔'' عِصام نے اسے دیکھتے ہی گزارش کی۔ وہ شکل سے ہی تھکا لگ رہا تھا۔

''جی۔''

''تم میرے ساتھ آرہی ہو یا نانی کے پاس جانا ہے؟''عِصام نے ماہ نور سے پوچھا۔ماہ نور نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور ندا کی انگلی پکڑ لی۔اس کے انداز پر وہ دونوں ہنس دیے۔

''عِصام!''اسی لڑکوں کی محفل سے کسی نے پورا گلا پھاڑ کر پکارا۔عِصام نے ادھر دیکھا۔وہ ہاتھ ہلا کر اسے ادھر بلا رہے تھے۔

''آپ پلیز نانی کو بتا دیں۔''عِصام نے مڑ کے اس سے کہا اور پھر ہاتھ ہلاتا ادھر ہی چل دیا جدھر سے اسے آواز لگائی گئی تھی۔

اس نے نانی کو پیغام دیا۔ماہ نور اس کے ہاتھ پکڑے ان دونوں بزرگوں سے دور بیٹھی تھی۔

نانی کو جب تک عِصام کی کال نہیں آئی، وہ اٹھیں نہیں۔اس نے وہیں ماہ نور کو خدا حافظ کہنا چاہا لیکن وہ اسے کھینچ کر کار تک لے آئی تھی۔اسے کچھ نظروں کی حیرت اور معنی خیزی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ ان کی وجہ سے ماہ نور کو جھڑکنا یا سخت بات کہنا نہیں چاہتی تھی۔

''اب تو امید ہے تم ہر فنکشن میں آؤ گے۔''اسے نہیں معلوم وہ ظریفہ چچی کا پوتا تھا یا نواسہ مگر اتنے دنوں میں وہ اسے خوب پہچان گئی تھی جو عِصام سے کہہ رہا تھا اور دیکھ اسے رہا تھا۔عِصام نے اس کی طرف دیکھے بنا سر ہلا دیا۔

کار گیٹ کے باہر نکلنے سے پہلے وہ اندر آ گئی۔

نانی سر ٹکا کر شاید سو گئی تھیں جب اچانک ماہ نور کی آواز آئی۔

''ضرورت کیا ہوتی ہے؟''

''آں؟''اس نے ٹھیک سنا سمجھا مگر لگا سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''ضرورت کیا ہوتی ہے؟''اس نے دوہرایا۔

''تمھیں کیوں جاننا ہے ؟''

''جہاں یہ ہوتی ہے آپی وہیں جاتی ہیں۔۔۔یہ کیا ہے؟''

''ضرورت موقع ہوتی ہے کسی کے لیے آسانی پا لینے کا کسی کے لیے مشکل کھڑی کرنے کا۔

ضرورت مجبوری ہوتی ہے کسی کے لیے جھک جانے کی، کسی کے لیے کچل دینے کی۔

ضرورت کسی کے لیے آس کا جگنو ہے، کسی کے لیے استحصال کا رستہ۔

کسی کو ضرورت ہو تو وہ محبت کر لیتا ہے اور کوئی ضرورت اس لیے بن جاتا ہے کہ اس سے محبت ہوتی ہے۔۔۔ ''

''بتائیں نا!''ماہ نور نے کہا تو وہ چونکا۔

''جان کر کیا کرنا ہے؟''اس نے ہلکے انداز میں کہتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا۔

''اسے اپنے گھر میں لانا ہے پھر آپی بھی وہیں رہیں گی۔''

عِصام کو پل بھر کے لیے لگا ساری دنیا رک گئی ہے۔ماہ نور کے جملے نے کب سے ملتوی اور نظر انداز ہو رہا سچ برہنہ کر دیا تھا جس سے نظر چرانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

''ماہ نور کی ضرورت۔۔۔''

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جانے کس منظر میں الجھ کر اپنا سوال بھول گئی تھی لیکن اسے ان لمحوں میں اس کی ندا سے انسیت کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ اس میں قصور بھی اس کا ہی تھا جس نے زندگی میں اسے بس دو ہی رشتے دیے تھے۔

☆☆☆☆

''ندا! تم یہ سوٹ کل مہندی میں پہننا، بہت جچے گا تم پر۔'' سب اگلے دن کے کپڑے، زیور میک اپ ایک دوسرے کو دکھا رہی تھیں جب مومل بھابھی نے اپنا ایک پرانی خاندانی شادی میں پہنا جوڑا اسے تھمایا۔

اس نے لے لیا لیکن اس کا ارادہ نہیں تھا پہننے کا۔ اسے بھاری جوڑے اکثر چبھتے تھے۔ اللہ جانے عادت نہیں تھی اس لیے یا واقعی وہ ایسے ہی ہوتے تھے۔ دوسرے اس کو ڈیزائن بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ سب سے بڑی مشکل اس کا سب کچھ آر پار دکھانے والا برائے نام کا آرگینزا دوپٹا تھا۔ کام اور بھاگ دوڑ کرتے ہوئے وہ اسے نہیں پہن سکتی تھی۔

اگلے دن وہ اپنا ہی جوڑا پہن کر تیار تھی۔ تقریب لان میں تھی اور مرد و خواتین کا الگ انتظام نہیں تھا۔ زیادہ تر قریب، دور اور بہت دور والے رشتے دار ہی تھے۔ جب وہ خاص مہمانوں کو مشروبات بانٹ رہی تھی، مومل بھابھی کی نظر اس پر پڑ گئی۔

''تم نے وہ ڈریس نہیں پہنا؟ خاص آج کے فنکشن کے لیے ڈھونڈ کے نکالا تھا۔ وہ رنگ بھی تم پر جچتا۔ اتنا سوچ کر اس سوٹ کو چوز کیا تھا تمھارے لیے اور تم۔۔۔ خیر سب کی اپنی مرضی۔۔۔''

''بھابھی وہ کام کے دوران۔۔۔''

''کام کیا ہم نہیں کر رہے ہیں؟ خیر کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔''

''ارے بیٹا کیوں خفا ہوتی ہے ابھی بدل لے گی ندا۔'' اس کی امی وہیں موجود تھیں۔

''جاؤ شاباش بیٹا وہی پہن کر آؤ۔ بھابھی کا دل نہیں دکھاتے، اتنے پیار سے دیا ہے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو مومل۔'' کوئی اور کہتا تو اسے بے انتہا غصہ آتا لیکن اس وقت ماں کی بات پر اسے ان پر ترس آ گیا۔ اب مومل کے لیے نہیں اسے ماں کے لیے وہ پہننا تھا۔

وہ ٹرے پاس سے گزرتے کیٹرنگ والے عملے کو پکڑا کر پلٹی اور وہاں ماہ نور کا ہاتھ پکڑے عِصام کھڑا تھا۔ وہ شاید اسے دیکھ کر اسے ادھر لے آئی تھی۔ ماہ نور کو دیکھتے ہی جانے کیوں یکایک اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ننھی بچی یہاں باقیوں کے مقابلے بے ریا اور مخلص تھی۔ جسے بنا کسی مطلب کے اس سے انسیت تھی۔ جس سے اس کا کوئی

مطلب وابستہ نہیں تھا۔اس کے ساتھ مہربانی کر کے ،اچھا سلوک کر کے اسے اپنے نمبر نہیں بڑھانے تھے۔

''دو منٹ میں آئی بیٹا، یہیں رکو۔'' اس نے ماہ نور کے گال چھو کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔

روتے ہوئے اس نے وہ لباس پہنا اور آئینے میں دیکھ کر اپنا آپ بہت برا لگا۔اسے کسی کا دیا لباس پہننے میں عار نہیں تھا لیکن دینے والے کا رویہ تکلیف دہ تھا اگر وہ دینے کے بعد یہ سمجھے کہ اب نہ پہن کر وہ گناہ گار ہو گی۔ کیا غریب یا ضرورت مند کو اپنی پسند اور مرضی کا بھی حق نہیں رہ جاتا۔ وہ سوٹ ضائع تو نہ کرتی رقیہ کو دے دیتی یا بعد میں امی سے اس میں اپنی پسند اور مرضی سے تبدیلیاں کروا کر پہن لیتی۔ وہ تو کام میں سہولت ہو اس لیے آرگینزا کا دوپٹا نہیں اوڑھ رہی تھی لیکن ایسا کر کے بھی وہ ہی ناشکری ثابت ہو رہی تھی۔اول اول ایسے جوڑے دیکھ کر وہ سعدیہ سے کہتی تھی کہ آپ منع کر دیا کریں کہ میں اس طرح کے جوڑے پہنتی نہیں ہوں لیکن اس بات پر بھی لوگ خفا ہو جاتے تھے کہ نخرے دیکھو! اگر لے کر کسی اور کو دے دو یا پہنو ہی نہیں تو یہ بھی برا لگتا تھا کہ قدر ہی نہیں۔ ہم مدد اور مہربانی کرنے کے بعد بھی اپنی شرائط اور مرضی کو حق سمجھتے ہیں۔ کسی کو دے دینے کے بعد بھی اندر سے 'مالکانہ پن' نہیں جاتا ہے۔

واپس لان میں آئی تو مومل بھابھی گویا منتظر تھیں۔

''دیکھو کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ذرا دل نہیں تھا دینے کا میرا مگر اب ٹائٹ ہو گیا تھا۔'' وہ اپنی بہن سے کہہ رہی تھیں مگر سن سب رہے تھے۔

کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ ذرا کرسی پر ٹکی ہی تھی کہ فارعہ نے اسے اشارہ کیا وہ کھڑی ہو گئی۔

''کتنی بھجواؤں؟'' وہ فون پر پوچھ رہی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

''پانچ چھے کولڈ ڈرنکس ادھر دانیال اور اس کے دوست بیٹھے ہیں انھیں دے آؤ پلیز۔

''اس نے لان میں ادھر ہی اشارہ کیا جدھر دیکھ کر وہ اس دن پلٹ گئی تھی۔

وہ کولڈ ڈرنک کے ٹن پلیٹ میں رکھ کر لے آئی۔

''آپ کسی سے بھجوا دیں۔۔۔'' ساتھ ہی وہ کسی لڑکے یا بچے کو دیکھ رہی تھی جسے پکار کر پلیٹ تھما سکے۔

''یہ سامنے تو ہے جاؤ تم ہی دے آؤ۔''

مگر وہ ہلی نہیں۔متلاشی نظریں چاروں جانب دیکھ رہی تھیں۔

''جاؤ بھی۔وہ غصہ ہو گا۔'' فارعہ نے ذرا بے زار اور سخت لہجے میں کہا۔

''میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔'' دائیں جانب کی کرسیوں سے عِصام اٹھ کر آیا اور اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی۔آج صرف وہ آیا تھا۔نانی سر درد سے پریشان تھیں اس لیے اسے زبردستی حاضری لگانے بھیجا تھا۔

وہ شکریہ بھی نہیں بول سکی اور وہ چلا گیا۔ فارعہ نے اسے بری طرح گھورا۔ دانیال نے اس کا نام لے کر کہا تھا کہ اسے کسی بہانے ادھر بھیجو اور اسے ذرا ذرا سی بات پر غصہ آجاتا تھا۔

وہ سب دلہے اور دانیال کے دوست تھے۔ ساتھ کچھ قریبی کزنز بھی جو ہلے غلے اور موج مستی کے لیے مشہور تھے۔

☆☆☆☆

اگلا دن زیادہ ہنگامہ خیز تھا۔ آج مشترکہ مہندی تھی۔ وہ تھک گئی تھی اور اب دعا کر رہی تھی جلد یہ شادیاں ختم ہوں۔ وہ کسی کام کو منع نہیں کر سکتی تھی اور سارے مہمان، پورا گھر اندھا ہو گیا تھا جو انھیں دانیال اور اس کے دوستوں کا اسے دیکھ کر قہقہے لگانا اور ذو معنی جملے کسنا نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ تو خود بھی ان کے ساتھ مل کر ہنسنے لگ جاتے تھے۔ ایک مزے کی تفریح ان کے ہاتھ لگی تھی۔ اس کا کترا کر نکلنا، نظریں نیچی رکھنا، بات نہ کرنا، ان کے قریب سے تیزی سے گزرنا، سب کچھ ان کے لیے مذاق تھا۔ وہ اسے ایک ڈری سہمی لڑکی سمجھ کر تنگ کر رہے تھے۔ وہ آسان نشانہ تھی کہ باقیوں کی طرح اس کے دفاع میں کوئی کودنے والا نہ تھا۔

مہمان جا چکے تھے۔ گھر میں موجود تھک ہار کر کمروں میں بند تھے۔ وہ بھی نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ ظریفہ چچی سے کہنے آئی تھی کہ ان کے کل کے کپڑے استری ہو گئے ہیں اجازت ہو تو سو جاؤں، تب نانی کو بھی جانے کا خیال آیا۔ ماہ نور ان کے پاس ہی سو گئی تھی اور عِصام ان کے انتظار میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا جمائیاں روک رہا تھا۔ نانی جانے کے لیے اٹھیں تو انھیں اپنا پرس نہیں ملا۔

''دیکھو ذرا جہاں میں بیٹھی تھی شاید بغل والی کرسی پر رکھا تھا، اٹھانا بھول گئی۔'' انھوں نے ندا کو دیکھا۔

''جی۔'' وہ باہر نکلنے لگی تھی کہ انھیں یاد آیا۔

''ادھر سے عِصام کو بھی بلا لو، ماہ نور کو اٹھا لے گا۔'' وہ ایک اور جی کہتی ڈرائنگ روم میں آئی۔ جہاں دانیال اور عِصام کے ساتھ چند لوگ بیٹھے تھے۔

''ماہ نور سو گئی ہے، نانی آپ کو بلا رہی ہیں۔'' وہ پیغام دے کر باہر آئی۔

کرسیوں پر تو کہیں پرس نظر نہیں آیا۔ وہ جھک کر کرسیوں کے نیچے دیکھنے لگی۔

''یہ رہا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر پرس اٹھایا اور سیدھی ہوئی۔

''اب ان ظریفہ چچی کے یہاں پھر نہیں آؤں گی۔'' اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ دانیال اور اس جیسے لوگوں کو کیوں برداشت کرے۔ وہ جس کام کے لیے آئی تھی اس میں یہ تو شامل نہیں تھا۔ اسے زیادہ غصہ، دیکھ کر انجان بننے والوں پر تھا اور ان میں بھی سب سے زیادہ ظریفہ چچی کے گھر والوں کی بے حسی پر تھا۔

سامنے کوئی آیا تو سر اٹھائے بنا دائیں جانب ہوئی وہ بھی دائیں آ گیا، اس نے دوسری طرف سے جانا چاہا، وہاں بھی راستہ مسدود۔ اس نے سر اٹھایا، سامنے دانیال تھا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ سامنے سے ہٹیں۔'' اس کی ناگواری واضح تھی، آواز کی ترشی اور تیزی بھی۔

دانیال نے ابرو اونچے کرتے ہوئے ہونٹوں کا زاویہ بدلا جس کا مطلب تھا، 'واہ تم بولتی بھی ہو!' اس کا انداز حیرت کے ساتھ تمسخر بھی سمیٹے تھا۔

وہ وہیں ڈٹا رہا، ندا نے بازو سے نکلنا چاہا مگر وہ پھر سامنے آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' پیچھے سے عِصام کی آواز آئی۔ دانیال کے اطمینان میں کوئی خلل نہیں پڑا۔

''کچھ نہیں۔ دو دن اچھا کھا لیں ڈھنگ کا پہن لیں تو کچھ لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔'' کوئی زناٹے دار چابک اس کی روح پر پڑا تھا۔

''دو دن اچھا کھانا اور پہناوا دینے کے بعد کچھ لوگ اپنی اوقات پر آ جاتے ہیں۔'' جتنی تلملانے والی مار تھی، جملہ بھی اس کے منہ سے اسی درجے کا نکلا تھا۔ اس کے الفاظ تھے یا چہرے پر اور آواز میں لپکتے شعلے کہ وہ بھڑک اٹھا۔

''اوقات؟ ابھی دونوں کی اوقات پتہ چل جائے گی۔۔۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ عِصام نے ہوا میں اس کا بازو پکڑ لیا۔

''واٹ دا۔۔۔''اس طیش اور حیرت میں پہلے عِصام کو بے یقینی سے دیکھا پھر اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑایا۔

''تم دور رہو۔''اسے اپنے ہم مزاجوں میں گھرے رہنے کی عادت تھی۔اس موقعے پر وہ چند فقرے، کچھ قہقہے اور 'چیئر لیڈر' کی توقع تو کر سکتا تھا، کسی کے یوں راستہ روکنے کی نہیں۔

''اور تم بھی۔''عِصام نے سکون سے کہہ کر ندا کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔وہ جانے لگی تھی کہ دانیال نے بازو پھیلا کر اس کا راستہ روکا۔

''تمھیں کیوں اس سے ہمدردی ہے؟''

''بات مت بڑھاؤ، اسے نانی کا پرس دینا ہے، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''دانیال نے ندا کے ہاتھ سے پرس جھپٹ کے اس کی طرف اچھالا، جو نیچے گر گیا۔

''جاؤ۔''اب کے عِصام نے گردن اور آنکھ کی جنبش سے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ بھی کیا۔ندا نے جھک کر پرس اٹھایا اور بھاگ لیتی کہ دانیال بولا۔

''او نہوں۔۔۔ہماری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔''وہ ندا سے مخاطب تھا۔

''تم بات کر ہی لو جو اتنے دن سے تمھیں پریشان کر رہی ہے۔''جواب عِصام نے دیا۔

''اتنی بھیڑ میں ایک تمھاری ہی نظر ہے اس پر۔۔۔''دانیال نے ندا کو دیکھا جو غصے میں اسے گھورے جا رہی تھی اور پھر عِصام کو۔

''نظر تو بہت سوں کی تھی یہ اور بات میں ان کی طرح جان بوجھ کر اندھا نہیں بن سکا۔

''اس بار عِصام کا لہجہ معمولی نہیں تھا۔ وہ بھی دانیال کے رویے پر اندر ہی کھول کھول کر تھک گیا تھا۔ ایک بار صاف بات ہو ہی جانا بہتر تھا۔

''پرس ملا یا نہیں اتنی دیر کیوں۔۔۔'' وہ ان تینوں کو دیکھ کر رک گئیں۔ دانیال شیر ہو گیا۔

''مانا یہ تمھارے گھر کچھ دن رہ آئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔۔۔''

''بکواس نہیں دانیال! میں لحاظ کر رہا ہوں۔'' عِصام نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہہ کی۔ ندا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نانی کے پیچھے ظریفہ چچی بھی تھیں۔ ان دونوں کی آوازیں اونچی ہو گئی تھیں۔

''آج بتا ہی دو تمھیں اس نوکرانی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟'' دانیال نے ندا کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور ندا کا دل کیا اس کا منہ نوچ ڈالے۔

''عِصام! کیا بات ہے، کیا کہہ رہا ہے دانیال؟'' نانی ان کے پاس پہنچیں۔

''کچھ نہیں نانی میں آپ کا پرس لینے ادھر آیا تھا۔۔۔ دانیال کو بدتمیزی کرتے دیکھا تو ۔۔۔''

''تم اسے اکیلی سمجھ کر ادھر آئے تھے، مجھے دیکھ کر تمھارا موڈ آف ہو گیا اس لیے۔۔۔ ''

''شٹ اپ!''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟''نانی نے کہتے ہوئے پاس کھڑی ظریفہ چچی کو دیکھا۔

''آنٹی!''عِصام کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔

''میں نے سارے فنکشنز میں نوٹ کیا ہے دانیال اور اس کے فرینڈز ندا کو ٹیز کرتے رہے ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے آج بھی دانیال اس پر ہاتھ اٹھا رہا تھا تب میں نے روکا۔''

''دانیال؟''ظریفہ آنٹی نے دکھ سے اسے دیکھا۔تب تک پیچھے دانیال کی بہن، بھابھی اور بھائی بھی آ گئے تھے۔

''جھوٹ بول رہا ہے یہ۔۔۔''دانیال چلایا۔

''ندا سے پوچھیں۔''عِصام نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

''ہاہا۔''وہ زور سے تمسخرانہ انداز میں ہنسا

''اس سے۔۔۔اس سے پوچھیں۔۔۔''

''کیوں؟میرے منہ میں زبان نہیں ہے یا میری زبان یہاں کسی کو سمجھ نہیں آئے گی؟''ندا کا جملہ تیر کی نوک کی طرح تیز تھا۔

''آج دانیال نے حد کر اس کی ہے مگر یہ بدتمیزی پہلی بار نہیں ہوئی ہے۔۔۔''وہ ظریفہ چچی کو دیکھ کر کہنے لگی۔وہ اب تک چپ تھی لیکن اب جب سب کے سامنے بات ہو ہی رہی تھی تو وہ کیوں منہ بند رکھتی۔

''کیا بکواس ہے؟ کون سی بد تمیزی کر دی اس نے ذرا ہنسی مذاق ہی کرتا ہے، تم کون سا آسمان سے اتری ہو جس کے ساتھ مذاق کرنا منع ہے؟'' فارعہ آگے آئی۔

''آپ بھی زمین کی ہی ہیں تو پھر اسے کہیں یہ سارے ہنسی مذاق آپ کے ساتھ کرے۔'' اس نے فارعہ کے انداز میں ہی جواب دیا۔

''تم۔۔۔'' فارعہ ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی تھی۔

''نانی!'' اس نے فارعہ کو نظر انداز کر کے پھر ظریفہ چچی کو دیکھا۔

''معاف کیجیے گا لیکن میں شادی ہونے تک نہیں رک سکتی۔ میں ابھی گھر جا رہی ہوں۔ ''

''دادی! یہ دو کوڑی کی لڑکی ہمیں سنا رہی ہے اور آپ خاموش ہیں۔۔۔'' مومل بھابھی نے بھی حصہ لیا۔

''میں دو کوڑی کی ہوں یا پھوٹی کوڑی کی آپ کی مہمان ہوں، آپ نے بلایا ہے۔۔۔ چلیں ملازم ہی کہیں۔۔۔ لیکن اپنے گھر میں بھی جھانکیں، یہاں آنے والوں کے ساتھ ہو رہا سلوک اس گھر میں رہنے والوں کی قیمت بھی طے کرتا ہے۔''

''تم۔۔۔'' مومل نے مٹھیاں بھینچیں۔ اگر ظریفہ چچی، نانی اور عِصام نہ موجود ہوتے تو وہ اب تک اسے تھپڑ رسید کر چکی ہوتی۔

' نانی آپ کا پرس۔'' اس نے انھیں پرس دیا اور آگے بڑھی تھی کہ دانیال کی آواز آئی۔

''رکو۔۔۔'' وہ چلتا اس کے سامنے آیا۔ عِصام بھی نانی کے پاس کھڑا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں تمھیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟'' اس کا مخاطب عِصام تھا۔

''یہ صرف ندا سے ہمدردی نہیں ہے ایسی سچوئشن میں کوئی بھی ہو، بدتمیزی کرنے والے کو روکنا ہر موجود شخص کا فرض ہے، چلیں نانی۔''

''ارے رکو۔۔۔ یہ کوئی نہیں اس گھر کی نوکرانی ہے۔۔۔''

''اور۔۔۔ اس سے کیا بدلتا ہے؟'' عِصام نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''تمھارے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔؟''

''چلیں نانی۔'' عِصام نے اس کا فضول سوال نظر انداز کیا اور ان کا ہاتھ تھاما۔

''نہ کوئی فرق پڑتا ہے نہ کچھ بدلتا ہے تو کیا تم اس سے شادی کر سکتے ہو۔۔۔'' دانیال کا انداز دعوتِ مبارزت دینے والا تھا۔ عِصام کو بڑا برا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے دانیال کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں چیلنج تھا۔ عِصام نے نظروں کا زاویہ بدل کے ندا کو دیکھا۔ آس پاس کے لوگ، آوازیں، چیزیں سب غائب ہو گئیں۔ وہاں وہ تھا، ندا اور۔۔۔ کوئی بہت اہم۔

پہلا دن، اپنی واپسی کا دن، اس کے گھر کی ملاقات، اس کی ٹفن اور تحفے کے ساتھ آمد، ظریفہ آنٹی کے یہاں ملاقات، ابھی دانیال کو جواب دینا۔۔۔ اور۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ کچھ خیالی، کچھ حقیقی۔۔۔ اور ماہ نور! لیکن کسی کے ساتھ عمر بھر کے وعدے میں بندھ جانے کے لیے کچھ اور بھی ضروری تھا۔

''کیا میں اس کے ساتھ ساری زندگی گزار سکتا ہوں۔۔۔؟''آسان سا ایک سوال تھا اور جواب بھی ہاں یا نہ اتنا سادہ تھا۔

کبھی ہم بہت طویل، خود کو سمجھنے والا، خود کو بازیاب کرنے والا، اپنا تریاق ڈھونڈنے والا سفر لمحوں میں طے کر کے واپس آجاتے ہیں اور دنیا وہیں کی وہیں ہوتی ہے۔

اس نے نظروں کا زاویہ بدل کے دانیال کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں۔۔۔''

منہ سب کے کھلے رہ گئے تھے مگر نانی اور ندا بھونچکی سی اسے دیکھنے لگیں۔ سبھی کو اس کی دماغی حالت پر شبہ تھا۔

''اگر نانی اور ندا کو اعتراض نہ ہو۔'' وہ اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

دانیال نے زور سے ایک تالی بجائی۔

''یہ۔۔۔دیکھا آپ سب نے۔۔۔''اس نے گھوم کر سب کو مخاطب کیا۔

''یہ چل رہا ہے ان کے بیچ، یہ ساری ہمدردی۔۔۔''عِصام کا گھونسہ اس کے چہرے پر پڑا اور بات ادھوری رہ گئی۔اس سے پہلے کہ وہ عصام پر جھپٹتا، دانیال کے بڑے بھائی آگے آئے۔

''ارے۔۔۔تم دونوں۔۔۔''

ایک ساتھ شور اٹھا تھا۔ سب بول رہے تھے مگر اگلے پل ندا کی اونچی آواز پر سب ٹھٹھک کر چپ ہو گئے۔ وہ دانیال اور عِصام کے پاس آئی۔ دانیال ناک پر ہاتھ رکھے غصے میں بل کھا رہا تھا۔

''یہاں میری شادی کے ذکر کی کوئی تک نہیں اور میری شادی کے فیصلے آپ دونوں کیوں کریں گے؟ ہوتے کون ہیں آپ؟'' اس نے عِصام کو دیکھا تو اتنا ہی غصہ تھا جتنا دانیال کو دیکھتے وقت۔

''دانیال کا رویہ کسی برتری کے احساس کا نتیجہ ہے اور آپ کا بھی۔''

وہ چپ تھا۔ اسے مزید کچھ کہنے کی چاہ تھی نہ اس وقت کسی سے الجھنا تھا۔ اس سے بھی نہیں جس سے وہ شادی کے لیے رضامندی کا اظہار کر چکا تھا۔

''فیصلے چاہے وہ آپ کے نزدیک بھلائی اور نیکی ہوں، کبھی تھوپے نہیں جاتے۔ دانیال کے الزام جتنا برا مجھے آپ کا ہاں بھی لگا ہے۔''

اندر ابال اٹھ رہے تھے۔ کھری کھری سنانے کی خواہش تھی مگر مارے غصے کے وہ مزید کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ آگے بڑھی پھر رک کر سب کو دیکھا۔

''ابھی ابھی جو پرپوزل رکھے گئے ہیں میں ۔۔۔ میں خود۔۔۔'' اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

''ان سب سے انکار کر کے جا رہی ہوں۔ زبردستی کی مہربانی بھی بدتمیزی ہی ہے۔''

کمرے میں آ کر اس نے ادھر ادھر سے چیزیں اٹھا کر بیگ میں ٹھونسیں اور بیگ کاندھے پر ڈال کر باہر نکل گئی۔ ذرا رک کر فون میں وقت دیکھا۔ اتنی دیر سے اکیلے گھر جانا مناسب نہیں تھا مگر اب وہ اس گھر میں ایک منٹ رکنا نہیں چاہتی تھی۔

''باہر سے ماجد کو فون کر کے بلالوں گی۔''

وہ سوچ کر باہر آئی۔ جہاں سب موجود تھے سوائے دانیال کے اور سب بول رہے تھے۔ وہ سب کو نظر انداز کرتی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

''ندا!'' نانی نے پکارا۔

''بہت رات ہو گئی ہے ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔ آؤ۔'' انھوں نے پچھلا دروازہ کھولا۔

''میں چلی جاؤں گی۔'' اس کا غصہ ہنوز تھا۔

''اکیلی کیسے جاؤ گی۔۔۔'' ظریفہ چچی نے کہا۔

''تم میری ذمہ داری ہو، آپا چھوڑ دیں گی تمھیں۔ ان کے ساتھ جاؤ۔'' ان کا لہجہ کسی بھی جذبے سے خالی تھا حتی کے فکر اور ذمہ داری سے بھی جس کا اظہار وہ الفاظ تھے۔

اس نے گہرا سانس لیا اور پیچھے بیٹھ گئی جہاں ماہ نور سوئی تھی۔ اندر بیٹھنے کے بعد اس نے غور کیا کہ عِصام پہلے سے ڈرائیونگ نشست پر بیٹھا ہے۔

نانی نے صرف ظریفہ چچی کو خدا حافظ کہا اور اگلی نشست پر بیٹھ گئیں۔ ذرا دیر میں گیٹ سے نکل کر گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ نظر جھکائے غصہ کم کرنے کی کوشش کر

رہی تھی۔ عِصام سختی سے منہ بند کیے سڑک کو گھور رہا تھا۔ نانی نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''یہ سب جو۔۔۔''

''نانی! گھر پہنچ کر۔'' عِصام نے سامنے سے نظریں ہٹائے بنا کہا۔

نانی چپ ہو گئیں۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے رقیہ کو فون کیا۔

''دروازہ کھولو۔''

''انھیں جگانا ہوتا تو فون کیوں کرتی، دروازہ ہی بجا دیتی۔۔۔'' اس کا لہجہ جھنجھلاہٹ کا شکار تھا۔

''ہاں۔۔۔ وہیں رکو۔'' گاڑی دروازے کے سامنے رکتی اس سے پہلے بے اختیار ہی اس نے سوئی ماہ نور کی پیشانی پر پیار کیا تھا۔

''شکریہ نانی۔'' ان کی طرف دیکھے بغیر کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ رقیہ دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ وہ اندر آئی اور کار آگے بڑھ گئی۔

''کیا ہوا؟ اتنی رات میں کیوں آئی ہو؟ کس نے چھوڑا۔۔۔ اتنا غصہ۔۔۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بول رہی تھی۔ دو کمرے تھے ایک میں وہ تینوں سوتی تھیں اور ماجد مہمان خانے میں۔ وہ دونوں باورچی خانے میں آئیں۔ ندا نے بیگ ایک طرف پھینکا اور پہلے گلاس بھر کے پانی پیا اور پھر پیڑھے پر بیٹھ گئی۔

''کوئی شادی یاد ونوں کینسل ہو گئیں؟''

''کینسل ہونے پر مجھے کس لیے غصہ آئے گا۔''

''پھر؟''ندا اسے دیکھنے لگی۔

''بولو بھی یا مارنا ہے مجھے!''رقیہ نے اس کا بازو ہلایا۔

''میں تمھارے بدلے کا بھی سنا کر آئی ہوں۔''وہ پہلی بار مسکرائی۔

ہمارے ساتھ غلط ہو رہا ہے، یہ سہنا زیادتی ہے، کسی کو بتانا چاہیے، آواز اٹھانا، مقابلہ کرنا، منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔۔۔ان باتوں کا، ان اصولوں کا ادراک ہونا اور ان سب پر عمل کر پانا دو مختلف کیفیات اور منفرد حوصلے ہیں اور سب کے اندر دونوں نہیں ہوتے ہیں۔رقیہ بھی سب جانتی تھی لیکن اس کے اندر وہ حوصلہ نہیں تھا کہ مقابلہ تو دور، اس کا ذکر بھی کسی سے کر پاتی۔ایسی صورت حال اسے مفلوج کر دیتی تھی۔اس کا ذکر بھی اس کے عضلات بے دم کر دیتا تھا۔

ظریفہ چچی کے یہاں اسے تنگ کرنے والا مومل بھابھی کا بھائی تھا۔ نظروں سے ہراساں اور پیچھا کرتے کرتے اس کی ہمت اتنی بڑھی کہ ہاتھ پکڑنے کی کوشش کے بعد وہ ایک دن اس کے کمرے تک آ گیا۔اس وقت کسی بچے کی آمد نے اسے بچا لیا تھا۔ ندا بڑی مشکل سے قسمیں دے کر اس سے اگلوا سکی تھی کہ وہ کیوں نہیں جانا چاہتی۔وہ اسے سناتے ہوئے بھی یوں کانپ رہی تھی کہ کسی بھی پل گر جائے گی۔رقیہ کو شبہ تھا کہ مومل بھابھی کو بھائی کے کرتوت کا اندازہ تھا لیکن وہ انجان بنی رہتی تھیں۔

وہ سعدیہ سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ گھر کے حالات ذرا ادھر ادھر ڈگمگاتے اور سعدیہ دعا کرتیں کہ کہیں سے فون آجائے۔ اس نے سوچا وہ ان سب کا مقابلہ کرلے گی اور ماں کو بھی مایوس نہیں ہونے دے گی مگر اب لگ رہا تھا وہ ظریفہ چچی ہی نہیں ہر گھر کو لات مار آئی تھی۔ اب فکر تھی کہ صبح سعدیہ کا ردعمل جانے کیا ہوگا۔ مشکل یہ تھی کہ اسے بہن جتنی ہی ماں بھی عزیز تھی۔

اس نے ساری کہانی میں عِصام والا حصہ حذف کرلیا تھا۔

☆☆☆☆

صبح اس کے جاگنے سے پہلے ظریفہ چچی کا فون بھی آگیا اور رقیہ نے بھی کچی پکی روداد سنا دی تھی۔ سعدیہ سمجھ نہیں پارہی تھیں کہ کیا ردعمل دیں۔ بیٹی نے غلط بھی نہیں کیا تھا ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ 'مگر ظریفہ چچی تو اچھی ہیں۔ اب بھی تو پیسے بھیج دیے ہیں چاہتی تو چار بات سنا کر کچھ نہ دیتیں!'

''کوئی بات نہیں، اب سوچو مت زیادہ۔'' انھوں نے اس سے اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی۔ ندا سمجھ نہیں پارہی تھی کہ ظریفہ چچی نے بھی وہی حصہ حذف کیا تھا یا سب کہہ سنایا تھا۔

شادی میں کوئی نہیں گیا۔ سعدیہ نے ذکر چھیڑا مگر رقیہ نے انھیں منع کر دیا کہ کسی کو جانے کی ضرورت نہیں۔ ماجد کو کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ شادی کے دو دن بعد وہ راز بھی کھل گیا جو وہ سینے میں چھپائے تھی۔ نانی نے سعدیہ کو فون کیا تھا۔

''تم نے ہمیں یہ بات کیوں نہیں بتائی ؟'' رقیہ اور وہ دونوں اس کے سامنے تھیں۔

''جب میں نے وہیں منع کر دیا تو کس لیے بتاتی؟''

''ابھی تسلیم آپا کا فون آیا تھا۔۔۔'' سعدیہ نانی کے فون کا بتانے لگیں۔

''اس وقت تو تم غصے میں تھی لیکن انھوں نے اب باقاعدہ رشتہ دیا ہے۔''

''آپ بھی اب باقاعدہ انکار کر دیں۔'' وہ اٹھ کر چلی گئی۔ سعدیہ نے بے بسی سے رقیہ کو دیکھا۔

''مجھے نہیں لگتا وہ مانے گی۔''

''پاگل ہوئی ہو، ایسے رشتے کو کیسے انکار کروں!'' وہ تو ایسا کچھ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں جو انھوں نے سنا تھا۔ اب کفران نعمت کیسے کرتیں۔

''کچھ دن ذکر نہ کریں۔ تھوڑے وقت بعد پھر پوچھیے گا۔''

''ہمم۔''

☆☆☆☆

''ہاؤ!'' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی تھی جب کان کے پاس ماہ نور کی آواز آئی۔

''ارے۔۔۔'' وہ اٹھ بیٹھی۔

''کس کے ساتھ آئیں؟'' اسے سوچ کر ہی کوفت ہوئی کہ نانی خود بات کرنے آئی ہیں۔

''ماموں کے۔'' وہ جو کھڑی ہو رہی تھی، واپس بیٹھ گئی۔

''آپ شادی میں کیوں نہیں آئیں؟''

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' سنتے ہی ماہ نور نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

''اب اچھی ہے۔'' ندا نے اس کا ہاتھ پیشانی سے ہٹا کر تھپکا۔

''ماہ نور!'' رقیہ اندر آئی۔

''آپ کو توتے دیکھنے ہیں نا، چلیں۔'' وہ کچھ کہتی اس سے قبل ہی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل بھی گئی۔ ان کے پڑوس میں توتے تھے۔

وہ اس آمد کا مقصد ہی سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اس گھر میں ایسا کوئی رواج نہیں تھا نہ یہ دروازہ کبھی بند ہوتا تھا۔ اس نے دوپٹا ٹھیک کیا اور وہیں پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی رہی کہ آنے والے کو پہچان گئی تھی۔ عِصام اندر آیا۔

''دو منٹ بیٹھ سکتا ہوں تاکہ کچھ بات کر سکوں؟''

اس نے عِصام کو دیکھے بغیر سامنے دیوار کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

شکر تھا آج ایک کرسی اس کمرے میں تھی یا اسے خاص یہاں رکھا گیا تھا ورنہ یہاں کرسی نہیں ہوتی تھی۔ کمرے میں بہت کم سامان تھا۔ ایک پلنگ، ایک بڑی الماری، سلائی مشین جس پر ایک گھڑی رکھی تھی اور چھوٹی سی پرانی الماری جس میں سعدیہ کا سلائی کا سامان اور سلائی کے کپڑے ہوتے تھے۔ رات سوتے وقت وہ دونوں اپنے بستر نیچے بچھاتی تھیں سعدیہ پلنگ پر سوتی تھیں۔ چھت کے قریب روشن دان نما کھڑکی کی وجہ سے کمرے میں قدرتی روشنی آرہی تھی۔

''اگر اس دن آپ میری بات سے ہرٹ ہوئی ہوں تو سوری۔۔۔''اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''معذرت اگر مگر سے شروع ہو تو کبھی سنسیئر (سچی) نہیں لگتی۔''وہ نیچے دیکھ رہی تھی لیکن آواز اس دن جیسی ہی بے لچک تھی۔

''آئی ایم سوری۔''عِصام خفیف سا مسکرایا۔

بھٹکتی نظر اس کے پیروں پر ٹھہر گئی۔ اس کے پیروں میں سفید جرابیں تھیں پھر بھی اس نے اپنے پیر پائنچے کے اندر چھپا لیے۔

''اگر۔۔۔ سوری نو اگر۔۔۔''اس نے ذرا رک کر ذہن میں جملے کی ترتیب بدلی۔

''وہ وقت اور موقع مناسب نہیں تھا لیکن میرا جواب کوئی نی جرک ری ایکشن (فوری ردعمل) نہیں تھا۔''

''میرا جواب بھی نی جرک ری ایکشن نہیں تھا۔''اس نے قصداً سر داور کھردرا رویہ روا رکھا تھا۔

''اسی کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

دل تو کیا کہہ دے 'میں نہیں بتانا چاہتی۔' لیکن اندر کا لاوا باہر نکلنے اچھل رہا تھا۔

''یہ نیک خیال ہو سکتا ہے، فلم اور ڈرامے کی کہانی بھی لیکن حقیقت نہیں۔''

''کیا؟''

''آپ کا مجھ سے شادی کے لیے ہاں کہنا۔''اس نے دو دو لفظ توڑ کر جملہ پورا کیا۔وہ ایسی نہیں تھی لیکن مقابل کا اعتماد اور انداز اسے اس طرح بولنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''آپ مان جائیں تو یہ آج شام تک بھی حقیقت بن سکتا ہے۔''

وہ ذرا دیر چپ ہو گئی۔اس طرح کی جملے بازی وہ گھنٹوں کر سکتے تھے اور نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔

''ہمارا کوئی میچ نہیں، ہم ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں، ہم میں زمین آسمان جیسا فرق ہے، میرے طبقے کے لوگ آپ کے خدمت گزار ہو سکتے ہیں، آپ کے برابر نہیں۔۔۔ابھی آپ دانیال کو دکھانے یہ کر بھی لیں تو زیادہ دور ساتھ چل نہیں سکیں گے۔۔۔''

''میں یہ دانیال کو دکھانے نہیں کرنا چاہتا۔''

''پھر۔۔۔؟'' بے اختیار اس نے بے بسی سے ہاتھ اٹھائے کہ کیسے اس بندے کو سمجھائے۔

''آپ مجھے پسند ہیں۔''

وہ سر جھکا کر ہنس دی۔

''برا مت مانیے گا لیکن آپ دنیا کو دکھانے، اور دانیال سے جیتنے کے لیے اس قدر بے تاب ہیں کہ جھوٹ بول کر مجھ سے ہاں بلوانا چاہتے ہیں۔''

''آؤچ!'' اس نے دھیرے سے کہا اور ہونٹ سختی سے بند کر کے سر کو ہلکی جنبش دی۔ یہ تکلیف کا اظہار تھا۔ اس کا جملہ آر پار ہو گیا تھا۔

''اب آپ پر اگر مگر کے بنا ایک سوری واجب ہو گئی ہے۔'' کچھ توقف کے بعد عِصام نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں کوئی میڈل یا ٹرافی نہیں ہوں جسے آپ دنیا کی تالیاں سننے حاصل کر کے شو کیس میں سجا کر بھول سکتے ہیں۔ اس دن کی سچوئشن میں سمجھ سکتی ہوں، کہ کیوں آپ نے ہاں کہا تھا لیکن اب اسے بھول جائیں یہ ممکن نہیں ہے۔۔۔'' وہ سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ وہ الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''اور اس طرح تو دانیال کا الزام بھی سچ ثابت ہو جائے گا کہ ہمارے درمیان کچھ تھا۔

''

عِصام کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

''ہم جہاں پیدا ہوئے وہ ہمارا قصور نہیں ہوتا ہے۔ مجھے کسی کے الزام کے سچ جھوٹ ہونے کی پروا بھی نہیں ہے۔ کوئی نہ ہماری زندگی میں جھانکتا ہے نہ دل میں۔ لوگ دور سے اندازے لگاتے ہیں تو لگانے دیں۔ مجھے نہ ستائش چاہیے نہ کسی کے فضول گاسپ کا ڈر ہے۔ ہاں یہ ہے کہ۔۔۔ ''وہ رک گیا کیونکہ وہ اتنے غور سے اسے دیکھ اور سن رہی تھی کہ وہ جملہ بھول گیا۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ اس کے بولنے کی منتظر تھی اور عِصام اسے دیکھتے ہوئے وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کی وجہ سے بھول گیا تھا۔

جب ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو ندا کو اس کی مسکراہٹ کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔

''آپ خود سے یہ سوال بھی نہیں کرنا چاہتیں کہ دانیال کو نکال دیں تو آپ کیا چاہتی ہیں۔ آپ پر دوسروں کی سوچ، ان کی باتیں اس قدر حاوی ہے کہ آپ نے دل دماغ کے در بند کر دیے ہیں۔ مجھے کسی سے میڈل نہیں چاہیے نہ کچھ ثابت کرنا ہے اور نہ میں کسی کی وجہ سے وہ چھوڑ سکتا ہوں جس کی خواہش ہے۔ ہاں، دانیال کو اتنا کریڈیٹ تو جاتا ہے کہ اس نے شاید مہینوں برسوں کا کام منٹوں میں کر دیا۔۔۔ ''وہ کھڑا ہو گیا۔

''ہمیں آج ہی شادی نہیں کرنی۔ آپ سوچیں اور اس وقت تک سوچیں جب تک ہمارے جواب مل نہیں جاتے، میں انتظار کروں گا۔''

وہ چلا گیا۔

ندا کے دماغ میں اس کے جملے گونج رہے تھے۔ دل و دماغ کو بند در کا طعنہ ایسا برا لگا کہ اب وہ چوپٹ وا تھے۔

☆☆☆☆

سعدیہ نے کوئی بات نہیں کی مگر رقیہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس وہی کہ وہ پرپوزل سیریس تھا۔'' وہ دونوں ٹیوشن کے بچوں کے جانے کے بعد دری پر بیٹھی تھیں۔

''اور؟''

''میں سوچ کر جواب دوں۔'' وہ سامنے پھیلے اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔

''پھر؟''

''سوچ لیا، جواب وہی ہے۔''

''کچھ دن بعد مزید سوچنا۔۔۔ پھر اور سوچنا۔ ''اس نے سکون سے کہا اور ندا گھور کے رہ گئی۔

وہ سوچتی یا جواب دیتی اس سے پہلے ماجد نے دھماکا کر دیا۔ سعدیہ تو گنگ رہ گئیں۔ ایک چھناکے سے ان کے سارے خواب، آس کے سب سے اونچے طاق سے حقیقت کے فرش پر گرے تھے۔

اس کے لیے کچھ نیا نہیں تھا۔ یہ ہی سب وہ خالہ سے سنتی آئی تھیں۔ اسے ماجد سے کسی ایسے ہی عمل کی توقع تھی۔ اس کی دنیا الگ ہی تھی۔ اس نے کبھی ماں اور بہنوں کی فکر نہیں کی تھی ہمیشہ اپنی ذات کو اول رکھا تھا لیکن ممتا کی ماری سعدیہ کبھی دیکھ ہی نہیں سکیں۔ اس نے انگلش لٹریچر میں گریجوئشن کیا، گولڈ میڈل لیا مگر سعدیہ نے اسے ماسٹر کرنے دیا نہ بی ایڈ۔ سادہ بی اے کی بنیاد پر اسے نجی اسکولوں میں جو تنخواہ مل رہی تھی اس سے زیادہ وہ ٹیوشن پڑھا کر کما لیتی تھی۔ اگر بی ایڈ کر لیا ہوتا تو وہ قابل تھی، ذہین بھی، اچھی ملازمت سے ان کے دن بدل جاتے مگر سعدیہ کو جانے کیوں سب بیٹے سے کروانا تھا۔ اس کے بی ایڈ یا مزید تعلیم کے اخراجات کی جگہ وہ ماجد کے نئے نئے کورس کی فیس دیتی رہی تھیں۔ ہر نئے کورس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا تھا اس کے بعد نوکری جلد مل جائے گی، پیکج اچھا ملے گا۔ مر مر کے اس نے بی بی اے کیا تھا۔ اور ایک جگہ ملازمت بھی مل گئی تھی۔ باقی وقت وہ کورسز میں گزار کر رات دیر سے گھر آتا، کھاتا اور سو جاتا۔ سعدیہ تھکے ماندے بیٹے کی آؤ بھگت کرنے اور خیال رکھنے میں کوئی کمی نہ رکھتیں۔ ان کی ساری امیدیں بیٹے سے وابستہ تھیں جو جلد ان کے دن بدلنے والا تھا۔ انھوں نے اسی امید میں بیٹیوں کو خاندان بھر میں دوڑایا کہ چار پیسے اور مل جائیں گے تو بیٹے کے ساتھ ساتھ ان سب کا مستقبل بھی سنور جائے گا مگر اب وہ اپنی پسند کی لڑکی ان کے سامنے کھڑی کر چکا تھا جس سے اسے جلد سے جلد شادی کرنا تھی۔ سعدیہ

کے آنسو رک نہیں رہے تھے۔انھوں نے بیٹیوں سے پہلے اس کی شادی کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''اس دن کے لیے اتنی تکلیفیں سہی تھیں کہ اچھے دنوں کی آس میں ہم خالی ہاتھ رہ جائیں اور کوئی ایرا غیرا آ کے میوہ کھائے۔دو جوان بہنیں بیٹھی ہیں ان کی شادی کی فکر نہیں، میری بھوڈھونڈنے کے ارمان تو مٹی ہو گئے۔۔۔''کچھ دیر بعد رونا بند ہوا تو انھوں نے بہن کو فون لگایا اور پھر دونوں مل کر غم غلط کرتی رہیں۔

اسے اتنی سہولت مل گئی کہ اب اس کی شادی کا ذکر سب بھول گئے تھے۔

ماجد سب طے کر چکا تھا بس دھیرے دھیرے ہر دن ایک نیا اعلان کرتا جا رہا تھا۔لڑکی والے ان کا گھر دیکھ گئے جو تھا تو کرایے کا مگر برسوں سے وہ وہیں رہ رہے تھے اور آگے بھی اسے چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ایک دن انھیں بھی فرحین کے گھر لے گیا۔ تاریخ بھی خود ہی بتا دی کہ یہ رکھ لیں اور یہ کہ تقاریب دونوں کی مشترکہ ہونا ہیں۔وہ ابھی سے پوری طرح لڑکی کے قابو میں تھا۔

سعدیہ کو لگ رہا تھا وہ کسی پرائے کی شادی میں شریک ہونے کی تیاری کر رہی ہیں۔نہ شادی کا جوش تھا نہ بہو میں دلچسپی۔اسے رقیہ اور سعدیہ کی طرح تعجب تھا نہ دکھ۔اس نے ماجد سے کوئی امید رکھی ہی نہیں تھی لیکن اس کی وجہ سے اسے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنا پڑے گا، یہ بھی کہاں سوچا تھا۔

سعدیہ نے اسے بلایا تو وہ سمجھی ماجد کی شکایتیں کر کے دل ہلکا کرنا ہو گا یا اسے سمجھانے کا کہیں گی مگر انھوں نے تو ایک نیا کانٹوں بھرا راستہ اس کے آگے بچھا دیا۔

''میری آنکھوں سے پٹی اتر گئی ہے، ماجد سے اب مجھے پانچ پیسے کی آس نہیں۔ تم دنوں کی ذمہ داری سے بھی اس نے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔ ہم تو شادی کا خرچہ اٹھانے لائق بھی نہیں۔ ایسے میں تسلیم آپا کا پیغام نعمت ہے بیٹا۔ تم وہاں بس جاؤ تو رقیہ کے نصیب بھی کھل جائیں گے۔ بڑے گھر سے رشتہ ہو تو لوگ بھی قدر کرنے لگتے ہیں۔ ماجد نے جو دکھ دیا ہے اس سے میرا دل اسی صورت میں بچ سکے گا۔۔۔ ورنہ مجھے تو لگتا ہے بند ہو جائے گا دکھ سے میرا دل۔'' وہ سینہ مسلتے ہوئے پھر رونے لگیں۔

اسے ماں کے صدمے کا اندازہ تھا۔ ان کی زندگی، ان کی جان ہی ماجد میں تھی۔ سارے خواب ان کی آنکھوں میں بیٹے کے لیے تھے۔ یہ جھوٹ نہیں تھا کہ اب انھیں کسی ایسی بڑی خوشی کی ضرورت تھی جو انھیں ماجد کے دیے صدمے سے نکال سکتی۔

''تم کل تک جواب دو مجھے تو پھر میں تسلیم آپا کو فون کر کے تاریخ اور باقی معاملات پکے کر لوں۔'' وہ فیصلہ سنا کر اسے جواب دینے کے لیے کل تک کی مہلت دے رہی تھیں۔

اسے ماجد پر اتنا غصہ آیا کہ اگر وہ اس وقت سامنے ہوتا یا گھر آجاتا تو وہ اس سے خوب لڑتی۔

اس کی وجہ سے وہ آگے پڑھ نہیں سکی،اس کی وجہ سے سعدیہ نے بیٹیوں کو دوسروں کا دائمی خدمت گار بنادیا،ان کی حیثیت دوسروں کی نظروں میں خود ہی کم کردی اور اب اسے وہاں شادی کرنے کہہ رہی تھیں جہاں وہ بالکل نہیں چاہتی تھی۔وہ پل بھر کو بھی سوچ لیتی کہ کیا برا ہے کر لیتی ہوں شادی! تو سانس اٹکنے لگتا۔ایسی بے جوڑ شادی میں وہ ساری عمر سر جھکا کر جینا نہیں چاہتی تھی۔وہ خود کو جانتی تھی کہ تمام آسائشوں اور سہولیات کے باوجود اگر بار بار اسے اپنی عزت نفس کو زخمی کرنا پڑے گا تو وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔نہ کسی کا احسان لے سکتی تھی اور کسی کے چند جملوں پر اعتبار کرنے اتنی احمق وہ نہیں تھی لیکن سعدیہ۔۔۔بس یہاں آکر سب بجھ رہا تھا۔

اس نے خود سے زیادہ حیثیت، مقام اور دولت والوں کے درمیان بھی خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا تھا۔اس کی خواہشیں کبھی کسی کو دیکھ کر کاش کاش نہیں کرتی تھیں۔ اونچے خواب دیکھ کر آنکھیں روشن اور پھر دل زخمی کرنے کی بجائے اس نے انھیں بے خواب رکھنا پسند کیا تھا۔اس نے مستقبل کے خواب سجائے نہ کبھی انھیں سوچنے میں وقت گنوایا۔وہ بس حال میں جیتی تھی مگر اب بلاارادہ ہی مستقبل کے خیال پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

اس نے سوچا انکار کر دے۔لیکن پھر اس کے بعد کا منظر آنکھوں کے سامنے آتا۔ سعدیہ کا رونا،ان کے دکھ،ان کا حال۔ساری زندگی مشقت کرنے والی،بیٹے سے دکھ پانے والی ماں تھوڑا تو سکون اور خوشی کی مستحق تھی،جسے ان کی جھولی میں ڈالنے پر

وہ قادر تھی۔اسے ماں کی غلطیاں بھی معلوم تھیں لیکن اس وجہ سے اسے کبھی ان پر غصہ نہیں آیا جیسے ماجد پر آتا تھا۔

''اب بس بھی کرو۔کیا خبط سوار ہوا ہے تم پر؟ ''پیچھے سے نیند میں ڈوبی رقیہ کی آواز آئی۔سب سو گئے تھے اور وہ کب سے نلکے کے پاس بیٹھی پیر رگڑے جا رہی تھی۔

''صبح دیکھنا تمھاری چپل ڈھیلی ہو جائے گی،قد بھی کم ہو گیا ہو گا گھس گھس کے۔۔۔ سو چو ذرا سارے باٹم کا ناپ بگڑ جائے گا۔۔۔اللہ کے واسطے اٹھ جاؤ اب۔لوگوں کی آدھی نیند ہو گئی۔''

''آ رہی ہوں۔''اس نے ہاتھ روک کر کہا۔

''جلدی آؤ۔''رقیہ کے جانے کے بعد اس کے ہاتھ میں پکڑا جھانواں پھینکا اور گھٹنوں پر سر رکھ کے رو دی۔

نہ ناخن گلابی ہو سکے تھے نہ تلووں کی دراڑیں غائب ہوئی تھیں،رنگت گھس گھس کر سرخ ہو رہی تھی مگر پیر اب بھی اتنے ہی کھردرے تھے۔

☆☆☆☆

سعدیہ نے نانی کو فون کیا اور وہ اسی شام آ گئیں۔ساتھ ماہ نور بھی تھی۔

''اب آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی؟''اس نے خوشی خوشی تصدیق چاہی۔اس نے زبردستی مسکرا کر سر ہلایا۔نانی نے اس کے ہاتھ میں پیسے رکھے، سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔وہ ان کے بارے میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکی تھی کہ وہ واقعی نیک فطرت ہیں یا یہ مظاہرہ بناوٹی عادت۔

رقیہ اور سعدیہ نانی کے ساتھ بازاروں کے چکر لگا رہی تھیں۔اس سے بس ناپ پوچھا جاتا۔ماجد اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ مصروف تھا۔اس نے سعدیہ کو کہا بھی کہ اسے بھی ساتھ رکھے مگر سعدیہ کو غصہ اتنا تھا کہ اب وہ گویا آنے والی بہو کو دکھانے اس کی شادی کی تیاریاں زور شور سے کر رہی تھیں۔اس کے آنے سے پہلے ہی مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔چوں کہ ماجد کی دونوں طرف سے ایک ہی مشترکہ تقریب تھی لہٰذا اس کا نکاح دو دن پہلے رکھا گیا تھا۔

وہ روز فون ہاتھ میں لیے سوچتی رہ جاتی کہ اسے بتا دے یہ فیصلہ اس کی امی کا ہے،اس کا نہیں۔

ابھی سوچتے سوچتے جانے کیسے سلام اس نے بھیج دیا۔ڈیلیٹ کرتی اس سے پہلے بلیو ٹک آ گئی ساتھ جواب بھی۔

''اب کیا کہوں؟''سلام تو اس نے بھیجا تھا۔بڑی دیر ہو گئی تو عِصام نے ہی پوچھا۔

''کچھ کہنا ہے؟''

اب اس کا جواب کیا دے؟ ہاں لکھا تو پھر اصل بات بولنا بھی پڑے گی۔۔۔ پھر کیا ہو گا ؟

''آپ اتنا سوچ رہی ہیں۔۔۔''ان دونوں کی مساوات بڑی تیزی سے بدلی تھی۔ ضروری، چند لفظوں سے لے کر وہ بحث اور اب یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ خاموشی سے معنی بھی اخذ ہو رہے تھے۔

''تو کوئی ناپسندیدہ بات ہو گی یا۔۔۔''

وہ بھی ایک ساتھ مکمل بات نہیں لکھ رہا تھا۔

''اگر میں خوش فہم نہیں ہو رہا ہوں۔۔۔ تو کیا آپ اس لیے شش و پنج میں ہیں کہ مجھے برا لگے گا؟''

''جی۔''اس نے غصے میں ترنت لکھا۔ اسے کیا حق کہ وہ اتنا صد فی صد اندازہ لگائے! ادھر عِصام نے گہرا سانس لیا۔ نانی اسے ماجد کی شادی اور سعدیہ کی حالت سنا چکی تھیں اور باقی نقطے اس نے خود جوڑ لیے تھے پھر بھی کہیں امید کی لو جھلملا رہی تھی جواب اس کی جی نے پھونک مار کر دھواں کر دی تھی۔

''چلیں یہ بھی برا آغاز نہیں کہ آپ میرے بارے میں سوچ رہی ہیں۔''

''اللہ حافظ۔''اس نے فون ایک طرف رکھ دیا۔

☆☆☆☆

نکاح نانی کے گھر پر ہی ہوا۔ وہ سب صبح سے وہاں آ گئے تھے۔ سب سے زیادہ خوش ماہ نور تھی۔ نکاح میں کم ہی لوگ تھے۔ رقیہ نے بتایا تھا کہ اگلے دن کسی ہوٹل میں ولیمہ بھی تھا۔

اپنی ساری تیاری دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ خرچ صرف نانی نے کیا ہے۔

''کسی کو بھی اپنے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔ انھوں نے مجھے بھی مخمل بنانے کی کوشش کی ہے لیکن۔۔۔'' چمکیلے سینڈل میں اس کی انگلیاں بھینچ گئیں۔

پہلی بار وہ ماہ نور کے چاچا اور پھپو سے ملی۔ عِصام کے چاچا تایا اور تینوں پھپو بھی آئی تھیں۔ نانی نے ویڈیو کال پر ماہ نور کی خالہ منزہ سے بھی ملوایا جو بیرون ملک مقیم تھیں۔

گھر میں نظر آ رہے لوگوں کی باتوں اور ہنسی مذاق سے اس نے اندازہ لگایا کہ زیادہ تر لوگ عِصام کے ساتھی اور ان کے اہل و اعیال تھے۔

''جانے کیسی شادی ہے یہ اور کون واقعی خوش ہے۔۔۔'' دس گیارہ دن کے قیام میں وہ ایک بار اس کے کمرے کے آگے سے بھی نہیں گزری تھی اور اب اسی کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔

''کم سے کم امی اور ماہ نور کی خوشی تو حقیقی ہے۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔

''آپ کو بھوک لگی ہے؟'' ماہ نور نے اندر آ کر پوچھا۔ بھوک تو اسے بہت لگی تھی بلکہ بھوک سے زیادہ شدید سر درد تھا۔ اس نے ہلکے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ماہ نور بڑے

پیار، انہماک اور اس طرح سے اسے دیکھ رہی تھی مانو اسے چھو کر دیکھنا چاہتی ہے مگر جھجھک اور ڈر بھی ہو۔

''آجاؤ۔''اس نے بازو میں ہاتھ رکھ کے اسے مسہری پر بلایا۔

وہ اپنے جوتے اتار کر جھٹ اوپر آگئی۔

''آپ بہت بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''آخر اس نے شرماتے ہوئے کہا۔وہ ہنس دی اور اس کے گال چھوئے۔

''لیکن آپ سے کم۔''

''اب آپ سچی ہمارے ساتھ رہیں گی؟''

''ہوں۔''اس سارے جھمیلے کی سب سے اچھی بات ماہ نور ہی تھی۔

وہ اٹھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

تبھی عِصام اپنے دوست اور اس کی بیوی ماہرہ کے ساتھ آیا۔

''یہاں تو پہلے سے ہاؤس فل ہے۔''

آواز سنتے ہی وہ اس سے دور ہوئی اور پلٹ کر بانہیں پھیلائیں۔عِصام مسہری کے کنارے آیا اور ماہ نور نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''تھینک یو آپی کو ہمارے گھر لانے کے لیے۔''

''اب یہ آپی نہیں آپ کی مامی ہیں۔''ماہرہ نے کہا۔اس نے ماموں سے الگ ہو کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمھیں جو اچھا لگے آپی یا مامی یا دونوں۔''اس نے فیصلہ ماہ نور پر چھوڑا۔

''اب چلو۔آپ کو نیند نہیں آ رہی؟ کل ایک اور فنکشن ہے۔'' ماہرہ نے اسے مسہری سے اتارا۔

''اس لیے جلد سونا ہے۔نانی بھی ویٹ کر رہی ہیں۔''

'عِصام نے جھک کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔

''چاہو تو نانی کے ساتھ سو جاؤ، کل اسکول نہیں ہے۔''

''اوکے۔''وہ ان دونوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔عِصام ان کے ساتھ دروازے تک گیا۔

''آپ اس لیے تو نہیں بیٹھی ہیں کہ مجھے برا لگے گا؟''اس کا انداز کچھ شوخ سا تھا۔

''آپ کو نہیں باقیوں کو برا نہ لگے اس لیے۔''وہ ایسی بد تمیز کبھی نہیں تھی جیسے اسے تڑتڑ جواب دینے لگی تھی۔اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اس سے بحث کرے گی یا ناراضی دکھائے گی۔اس نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔مگر اس کے متبسم جملے نے فوراً وہ دھارا اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور کر دیا۔مسہری سے اترتے ہوئے اسے شدت سے اس بات کا احساس ہوا۔ایسے تام جھام والے لباس سے بھی پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔دوسرا قدم رکھتے ہی پیر جانے لہنگے میں الجھا یا دوپٹے میں وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرتی اگر کمرے میں تنہا ہوتی۔جس تیور میں وہ نیچے اتری تھی، وہ پل میں بدل

گئے، اسے اپنی بے بسی اور حالت پر ایک دم رونا آ گیا۔ عِصام نے ایک ہی بازو تھاما تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ عصام کے سینے پر تھے۔

''میرے سر میں بہت درد ہے۔'' اس سے پہلے کہ آنسو لڑھک کر گالوں پر آتے اس نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''ٹیبلیٹ ہو گی دراز میں۔'' وہ آہستہ سے بازو آزاد کر کے 'نائٹ اسٹینڈ' کی طرف مڑا۔

ندا لباس لیے غسل خانے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد سادہ لباس میں باہر آئی تو وہ بھی کپڑے بدل چکا تھا۔

''وہاں ٹیبلیٹ اور پانی رکھا ہے لے لو۔''

''مجھے بھوک بھی لگی ہے۔'' اگر وہ یونہی درد کی ٹکیہ لے لیتی تو رات بھر تیز ابیت سونے نہ دیتی۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا؟'' دونوں نے ہی اس تبدیلی کو غیر اہم جانتے ہوئے نظر انداز کیا۔

''کسی نے پوچھا ہی نہیں۔'' وہ اب بھی منمنائی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

سبھی مہمان جا چکے تھے نانی کے کمرے کی بتی بھی بند تھی۔ سب کو صبح واپس آنا تھا۔

اس نے فریج سے بریانی نکالی اور مائیکرو ویو میں گرم کی۔ٹرے میں بریانی رائتہ اور کولڈ ڈرنک کا کین رکھ کر کمرے میں آیا تو وہ مسہری پر آڑھی ترچھی سو چکی تھی۔درد کی ٹکیہ اور گلاس یونہی دھرا تھا۔

اس نے جگہ بنا کر ٹرے بھی نائیٹ اسٹینڈ پر رکھ دی۔

وہ پلنگ کے کنارے بیٹھا، سوئی ندا کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ میں غرق تھا۔

''سونے دوں یا جگادوں، بلاارادہ آنکھ لگ گئی ہے یا جان بوجھ کر سوئی ہے، اتنے سخت موقف کے بعد وہ مان کیوں گئی، یہ ذہنی جسمانی تھکان کا اثر ہے یا میرے لیے کوئی میسج ---''

اس کا گہرے سرخ رنگ کی بیل بوٹوں سے سجا ایک ہاتھ گال کے نیچے اور دوسرا ہاتھ چادر پر تھا۔اس کی خالی کلائی دیکھ کر اسے وہ دو سیاہ چوڑیاں یاد آگئیں۔

آخر وہ وہاں سے اٹھا اور دروازہ بند کر کے اپنے لیٹنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے لگا کہ جس طرح وہ سوئی تھی، اس کے لیے وہاں جگہ نہیں بچی تھی۔

اپنی الٹی سیدھی وضع میں جب بے آرامی محسوس ہوئی تو اس کی آنکھ کھلی۔ہلکی سی روشنی میں دیوار دیکھتے ہوئے حواس بحال ہوئے اور جیسے ہی یاد آیا عِصام اس کے لیے کھانا لینے گیا تھا وہ جھٹ اٹھ بیٹھی۔

''اگر وہ آکر مجھے اس طرح دیکھ لیتے تو۔۔۔''اور تبھی نظر نائٹ اسٹینڈ سے ہوتی فرش پر سو رہے عِصام پر ٹھہری اور برق سی تیزی کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔

''میں اتنی دیر سوتی رہی!''

وہ آواز پیدا کیے بغیر مسہری کے کنارے آئی۔

''واہ تم نے تو پہلے دن ہی جگہ بدل لی!''اس نے طنزیہ انداز میں خود سے کہا۔

جس طرح وہ آج تک فرش پر سوتی آئی تھی، عِصام ویسے دری بچھا کر سویا تھا۔اس کے ذہن میں ان کے درمیان کا فرق اس قدر مضبوط تھا کہ پہلا خیال اسے وہی آیا جو عموماً دنیا کا تاثر ہے کہ اس جیسی لڑکیاں کیوں امیر لڑکوں کو پھنساتی ہیں۔

وہ اٹھ کے عِصام کے پاس آئی اور پنجوں کے بل بیٹھ کر اس کا شانہ ہلایا۔دوسری کوشش میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''بیڈ پر سوئیں۔''وہ کہہ کر کھڑی ہو گئی۔وہ چند سیکنڈ اسے یونہی دیکھتا رہا۔

''نہیں میں یہاں ٹھیک ہوں۔''اب بھی اس کے چہرے سے کچھ اخذ کر پانا مشکل تھا۔

''نہیں، بیڈ پر سوئیں۔''اس کا لہجہ اٹل تھا۔بحث کرنے کی بجائے وہ اپنا تکیہ اٹھا کر پلنگ پر آ گیا۔دفعتاً خیال آیا اور وہ پلٹا۔لیکن وہ فرش پر اس کی جگہ سنبھالنے کی بجائے نائٹ اسٹینڈ سے پلیٹ اٹھا رہی تھی۔

''ٹھنڈی ہو گئی ہو گی، گرم کر لو۔''

''ایسے ہی ٹھیک ہے۔'' وہ کنارے ٹک کر چمچ سے کھانے لگی۔ عِصام تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

وہ کوشش کر رہی تھی پھر بھی پلیٹ سے چمچ کے ٹکرانے کی آواز رک نہیں رہی تھی۔

اس سناٹے میں وہ آواز ڈراؤنی تھی، معنی خیز، عجیب یا مضحکہ خیز۔۔۔ مگر ہر بار وہ اپنے پیٹ اور سر کو کوس رہی تھی۔ اس نے تھوڑا سا کھانے کے بعد پانی پیا اور دوا لے لی۔

اسے احساس تھا پیچھے وہ سویا نہیں ہے۔

''میں یہ رکھ کر آتی ہوں۔'' اس نے پلیٹ اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ کچھوے کی چال سے وہ باورچی خانے میں گئی اور اس سے بھی سست چلتی واپس آئی۔

چوروں کی طرح کمرے کا دروازہ کھولا، بند کیا اور پلنگ پر آئی۔

وہ دوسری طرف کروٹ کیے تھا۔ ندا اس کی جانب پشت کر کے لیٹ گئی۔

''اتنی سختی سے رد کرنے کے بعد تم کیوں مان گئیں۔۔۔'' ذرا دیر بعد اس کی دھیمی آواز ابھری۔

''یہ سوال پوچھنا بنتا تو ہے۔۔۔'' ندا کا سانس رک گیا۔

''لیکن جواب سے زیادہ میرے لیے یہ اہم ہے کہ تم یہاں ہو سو۔۔۔'' نہ صرف سانس بحال ہوا بلکہ اب دل گویا اس کی اگلی بات سننے دوڑ کر کانوں میں آ بیٹھا تھا۔

''میں وجہ نہیں پوچھوں گا۔''

آنکھوں میں یکایک پانی جمع ہو گیا۔

پھر نیند میں ڈوبنے تک وہ اس طرف سے کسی نئے جملے کی منتظر رہی تھی۔

☆☆☆☆

اگلا دن بھی افراتفری سے شروع ہوا اور تھکا کر ختم ہوا۔ ولیمے میں ظریفہ چچی کے علاوہ ان کے گھر سے ان کا بڑا بیٹا اور بہو ہی شامل ہوئے تھے۔ ان کے پوتا پوتی نواسا نواسی، ان کے بچے وغیرہ کوئی نہیں آیا تھا۔

اس کے اگلے دن چوں کہ ماجد کی تقریب تھی لہٰذا وہ سعدیہ کے ساتھ گھر آ گئی۔ عِصام ہی انھیں چھوڑ گیا تھا۔ وہ پانچ سات منٹ کے لیے اندر بھی آیا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' رقیہ نے پوچھا۔ سعدیہ تھک کر سو گئی تھیں۔ وہ دونوں اپنے اپنے بستروں میں جاگ رہی تھیں۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آتا یہ شادی ہو گئی۔''

''کیوں؟''

''کیوں؟ تمھیں کیوں نظر نہیں آتا؟ اُس گھر سے آنے کے بعد یہ گھر مجھے ہی اس قدر میلا اور گندہ محسوس ہوتا ہے کہ لگتا ہے وہ اندر قدم رکھیں گے اور کپڑے گندے ہو

جائیں گے۔ایک چیز ایسی نہیں جو کامن ہو، جسے وجہ مان لیا جائے۔۔۔اس بے جوڑ شادی کا سب مذاق اڑائیں گے یا شک کریں گے۔"

"تم ایسا سب سوچتی رہو گی تو کبھی تمھیں وجہ نہیں ملے گی۔جب جوڑ بن گیا تو کیا بے جوڑ رہ گیا؟ لوگ تعریف بھی کریں گے، رشک بھی۔"

"تم کب سے اتنی امید والی باتیں کرنے لگی؟"

"جب سے تم مایوسی والی باتیں سوچنے لگی۔"

"سونے کی کوشش کرو کل بہت کام ہے۔"

اس نے بات ختم کر دی۔

اللہ اللہ کر کے نکاح ہوا کھانا اور پھر رخصتی۔ نانی، ماہ نور اور عِصام آئے تھے اور وہاں سب کسی عجوبے کی طرح انھیں دیکھ رہے تھے۔وہ تو ٹھیک تھے مگر اسے شرمندگی ہو رہی تھی، کبھی غصہ آ رہا تھا۔

وہ ایک دن اور گھر میں رکی رہی۔ارادہ تھا دو تین دن رہے گی لیکن ماجد اور بیگم ماجد کو دیکھ کر اس نے اسی شام رختِ سفر باندھ لیا۔ماہ نور سے فون پر بات کرتے ہوئے ہی اس نے پیغام دے دیا تھا کہ ماموں کو شام میں لینے بھیج دینا۔

سعدیہ اسے اندر بلانا چاہتی تھیں۔ نئی دلہن کو بھی ملنے کا اشتیاق تھا لیکن اس نے پہلا بیوپاپہ دکھا کر اس کی مصروفیت کا بہانہ بنایا اور ہارن کی آواز آتے ہی بیگ اٹھا کر باہر آ گئی۔اڑوس پڑوس والے الگ دیکھنے نکل آئے تھے۔

☆☆☆☆

ان دس دنوں میں اس نے سارا مکان بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب نانی نے اسے پورے مکان کا 'ٹور' کروایا۔ وہ ساتھ ساتھ اسے گھر کے دیگر معاملات بھی سمجھا رہی تھیں۔ کپڑے دھونے کے لیے مشین عِصام ہفتے میں دو بار لگاتا تھا، سنیچر اتوار کو کھانا بھی وہ بناتا تھا۔ گھر کا کریانہ اور دیگر چیزوں کی خریداری بھی وہی کرتا تھا۔ مختصراً سوائے ہفتے کے پانچ دن دو وقت کا کھانا بنانے کے باقی سب اس کے کاندھوں پر تھا۔ وہ کئی سال بیرون ملک میں اکیلا رہا تھا اس لیے ان باتوں کا عادی تھا۔ اوپر کے کام روپا کرتی تھی۔ ہر چند ہفتوں میں گھر کی تفصیلی صفائی کے لیے وہ کسی کمپنی سے لوگ بلوا لیتا تھا۔

نانی عِصام کی نانی تھیں۔ ان کی عمر اور صحت کے لحاظ سے یہ بہت بڑی بات تھی کہ ان کے ہاتھ پیر اور آنکھیں کان سب سلامت تھے۔ اس نے سارے کام اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ اتوار کو اس نے کھانا بنانا چاہا تو ماہ نور نے روک دیا۔

''کتنے دن سے آپ والا کھانا کھا رہے ہیں آج ماموں کو بنانے دیں۔''

ماہ نور کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اب وہ سویا رہتا اور ندا اٹھ کر اسے اسکول روانہ کر دیتی۔ وہ جانے سے پہلے ماموں کو نیند سے جگا کر اللہ حافظ کہنے کمرے میں آتی تھی۔

نانی کو وہ اب بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ان کا سلوک نہ والہانہ تھا نہ کسی قسم کی ناپسندیدگی نظر آتی تھی۔ان سے ملنے خاندان بھر کے لوگ آتے تھے۔ان کے سامنے بھی ان کا رویہ اچھا ہوتا تھا۔وہ کسی کو ان کی شادی یا اس کے بارے میں کریدنے یا نامناسب بات کرنے کا موقع نہیں دیتی تھیں۔

رقیہ اسے فون کر کے گھر کے حالات سے آگاہ کرتی رہتی جہاں ماحول خالہ کے گھر جیسا ہو گیا تھا۔سعدیہ کا خیال تھا کہ بہو کے نامناسب رویے کی شکایت بیٹے سے کریں گی تو وہ ضرور ماں کا ساتھ دے گا لیکن ان کا یہ مان بھی جلد ٹوٹ گیا۔فرحین نہ کسی کام کو ہاتھ لگاتی تھی نہ کمرے سے نکلتی تھی۔اب سعدیہ اور رقیہ کا بسیرا مہمان خانے میں تھا۔یہ سب سن کر اس کا گھر جانے کا دل ہی نہیں کرتا۔وہ سعدیہ اور رقیہ کو بھی گھر بلا لیتی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی اور عادتاً نظر پیچھے سوئے عِصام پر پڑی۔آج پھر اس کے پیر لحاف سے باہر تھے۔اس نے جھک کر اپنے پیروں کو دیکھا جو اس گھر میں آ کر بھی اس گھر کے لائق نہیں ہو سکے تھے۔

اس نے بال لپیٹ کر کیچر لگایا اور اس کی پائنتی آ کر رک گئی۔کچھ دیر اس کے گلابی سفید، کسی بھی دراڑ اور گرد سے پاک پیروں کو دیکھتی رہی پھر ان پر لحاف ڈال دیا۔یہ کام وہ بڑی آہستگی سے کرتی تھی۔آج بھی وہی احتیاط برتی تھی لیکن جانے کیسے وہ جاگ گیا یا پہلے سے جاگ رہا تھا۔

''آج بتا ہی دو!''اس کی وضع نہیں بدلی تھی۔نہ کوئی جنبش ہوئی تھی۔وہ ان چار لفظوں میں ہی اس کا مطلب سمجھ گئی۔

''ٹھنڈ لگتی ہو گی اس لیے۔''اس نے زمانے بھر کی لاپروائی اور لاتعلقی لہجے میں سموئی۔

''نہیں لگتی اسی لیے وہ باہر ہوتے ہیں۔''وہ سیدھا ہوا۔

''ٹھیک ہے اب نہیں کروں گی۔''

''لیکن سچ نہیں کہو گی۔''عِصام نے اسی کے لہجے میں کہا۔

''وہی کہا تھا۔''وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی اور عِصام نے لحاف منہ پر ڈال لیا۔

''یہ ہمیشہ لڑتے کیوں ہیں؟''ماہ نور کو جگانے اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ خود سے معصوم سا سوال پوچھ رہی تھی۔

ماہ نور کو اسکول روانہ کرنے کے بعد نانی کو ناشتہ دے کر اور اس کے ناشتے کی نصف تیاری کر کے کمرے میں آئی تو وہ بھی تیار ہو چکا تھا۔

''ماہ نور کی اسٹیشنری اور آرٹ کی چیزیں لانی ہیں۔''

''مجھے میسج کر دو۔''

وہیں کھڑے کھڑے اس نے یاد کر کے سب ایک ساتھ لکھا اور بھیج دیا۔عِصام کا فون نائٹ اسٹینڈ پر رکھا تھا۔آواز آئی اور اسکرین پر نوٹیفکیشن چمکا۔ندا چونکی اور پھر فون

قریب سے دیکھنے جھکی۔ عِصام کو یاد آیا، وہ تیزی سے ادھر لپکا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر ندا نے اس سے پہلے فون اٹھانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ فون عِصام کے ہاتھ میں تھا۔

''مجھے دکھائیں۔۔۔''اس نے فون اس کے ہاتھ سے لینا چاہا اور عِصام نے اس سے بچاتے ہوئے ہاتھ دائیں بائیں کرنے کے بعد اونچا کر لیا۔

''مجھے دیکھنا ہے۔۔۔''وہ اچک کر اس کے ہاتھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس اونچائی تک پہنچنے کے لیے اس نے عِصام کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چھلانگ لگائی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا لیکن عِصام کا ہاتھ نیچے آ گیا۔ وہ فون چھین کر خوشی خوشی دور ہو رہی تھی کہ عِصام کا ہاتھ اس کی کمر کے گرد زنجیر بن گیا اور وہ وہیں رہ گئی۔

''نمبر سیو کرتے ہوئے میں تمھارا نام بھول گیا تھا۔۔۔''قربت کے اولین لمحے تھے۔ عِصام کی آنکھوں سے جھانک رہے جذبوں کی تپش اور اس کے چہرے پر در آئی سرخی کی حدت میں مقابلہ ہو رہا تھا کہ کس میں زیادہ آنچ ہے۔

''اس وقت میری نظر ان پر پڑی۔۔۔''اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے شانے سے پھسل رہی کلائی میں موجود سیاہ کانچ کی چوڑی میں انگلی پھنسائی۔

''یاد رہ جائے اس لیے میں نے 'بلیک بینگلز' لکھ لیا تھا۔''

''تو نام اب تک یاد نہیں ہوا۔۔۔''اسے اپنی کلائی میں دو سیاہ چوڑیاں اچھی لگتی تھیں۔ شاد ہی اس کی کلائیاں ان سے خالی ہوتی تھیں۔

''اب میرے پاس تمھارے لیے اتنے نام ہیں کہ کون سا لکھوں، سمجھ نہیں آتا۔''اس نے چوڑی سے انگلی ہٹائی۔وہ ہاتھ کھینچنے لگی تھی کہ عصام نے ہاتھ رکھ دیا۔

''تمھیں سننا ہے۔۔۔؟بلکہ تم جو کہو گی وہ لکھ لیتا ہوں۔''

''یہ ہی رہنے دیں۔۔۔''وہ منمنائی۔

''اب چلیں ورنہ نانی آجائیں گی کہ اب تک ناشتے پر کیوں نہیں آئے۔''اس نے عِصام کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''تم مجھے ڈرا رہی ہو؟''

تبھی باہر سے نانی کی آواز آئی۔

''عِصام!ندا!دیر نہیں ہو گئی آج۔۔۔سب ٹھیک ہے؟''اس نے لمبا سانس لیا۔

''نانی کی عمر میں وہم ستاتے ہیں اور۔۔۔''وہ رکا پھر اس کے کان کے پاس جھکا۔

''ہماری عمر میں تمھارے جیسے صنم!''سیدھا ہو کر اس نے ندا کی رنگین صورت کو شرارت سے دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''سب ٹھیک ہے نانی۔۔۔''

☆☆☆☆

رقیہ نے فون کیا کہ تم گھر آجاؤ۔ عِصام کے دفتر جانے کے بعد وہ نانی سے اجازت لے کر گھر آئی۔ سعدیہ نے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ بہو کی باتیں ان کے کانوں میں پڑ گئی تھیں۔ وہ الگ ہونے کا سوچ چکے تھے۔

''میں نے تمھارے منہ سے نوالے چھین کر اسے کھلائے، تمھیں پڑھنے نہیں دیا، تم سے کام کروایا، در در بھٹکایا کہ کل کو وہ ہمارے دن بدل دے گا، تمھاری قربانیوں کا تمھاری مشقتوں کا صلہ دے گا۔ میں تھوڑی نا تمھاری دشمن تھی، مجھ سے غلطی یہ ہوئی ساری امیدیں اس سے لگائیں۔ ہائے رے میری پھوٹی قسمت۔۔۔'' انھوں نے اپنا سر پیٹا۔

''اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا ہم محنت کریں اور عیش کرنے کوئی اور آجائے۔ شرم بھی نہیں آتی ایسے لوگوں کو۔۔۔ جسے بڑھاپے کا سہارا سمجھا تھا وہ ابھی سے دامن چھڑا رہا ہے لیکن میں بھی ماں ہوں۔۔۔ ایک پرائی عورت کو اپنا بیٹا چھیننے نہیں دوں گی۔'' وہ خاموش رہی روکا نہ ٹوکا۔ آخر وہ ہی تھک کر چپ ہو گئیں۔ فرحین اس وقت گھر میں نہیں تھی۔

واپس ہونے سے پہلے وہ سعدیہ کو لے کر بیٹھی تھی۔

''امی اگر اب آپ کو لگ رہا ہے کہ ماجد کو اولیت دے کر آپ نے غلطی کی ہے تو اسے سدھار لیں۔ اس کے لیے روئیں مت، اس کے آگے گڑگڑائیں مت، اس کے پیچھے اپنی زندگی کا سکون برباد مت کریں۔ رونے کڑھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے تین

بچے ہیں۔ آپ اکیلی نہیں ہیں۔ وہ الگ گھر کی بات کریں تو اسے خوشی خوشی جانے دیں۔ آپ خفا ہوں گی باتیں سنائیں گی تو وہ دل خراب کر کے جائے گا۔ فائدہ کچھ نہیں ہو گا۔ خوشی سے جائے گا تو ملنا ملانا کرے گا۔ فون کرے گا۔ آپ بھی بیٹے کے گھر جایا آیا کرنا۔۔۔ آپ نے ساری توقعات اس سے باندھ رکھی تھیں، اسے ہی سہارا مان لیا تھا، وہ آپ کے لیے اچھے کل اور آرام دہ مستقبل کی گارنٹی تھا۔ اس لیے آپ کو اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔ لیکن اسے زبردستی روک کر بھی آپ کو کوئی خوشی نہیں ملے گی۔ دور جا کر وہ بھی سکون سے رہے گا آپ بھی۔ یہ روز روز کے لڑائی جھگڑے، کھینچا کھینچا ماحول بنا کر کون خوش ہے؟ خالہ کو دیکھ رہی ہیں نا آپ سارا وقت ان کے ذہن پر بہوئیں سوار رہتی ہیں۔ کیا کر رہی ہیں، کیوں کر رہی ہیں، کچھ نہیں کر رہیں تو کیوں نہیں، بیٹوں پر بھی سارا دھیان یہ ہے کہ بیویوں کی کتنی سنی اور ماں کی کتنی۔۔۔ پھر بی پی بڑھ جاتا ہے، شوگر بڑھ جاتی ہے۔ کیا فائدہ ایسی زندگی کا؟ جلنا کڑھنا دکھی ہی رہنا ہے تو کم سے کم سکون اور صحت کے لیے اکیلے رہ لیں! آپ اسے اس کی مرضی کرنے دیں۔ ویسے بھی وہ اب تک اپنی مرضی ہی کرتا آیا ہے۔ اب آپ بھی قبول کر لیں کہ وہ وہی کرتا ہے جو اسے کرنا ہوتا ہے۔ اللہ نے توفیق دی کسی دن احساس ہو جائے گا نہ ہونا ہوا تو ساری عمر ایسے ہی کٹ جائے گی۔ آپ اپنا سکون اطمینان دیکھیں اس کے لیے دعا کریں۔ سہارا اللہ کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔"

اب جانے وہ قائل ہوئی تھیں یا نہیں مگر اسے 'ایسا ہی کروں گی۔' کہا تو تھا۔

واپس آکر بھی اس کا ذہن ادھر ہی الجھا تھا۔ ماہ نور کی فرمائش پر اسے کہانی سنانے اس کے ساتھ لیٹی تھی۔ وہ سو گئی مگر وہ وہیں چھت کو تکتی لیٹی رہی۔

عِصام بازو میں آکر کھڑا ہوا تب وہ چونکی۔

احتیاط سے اٹھ کر اس کا لحاف درست کیا اور بتی بجھا کر اس کے ساتھ باہر آئی۔

''مجھے لگا ناراض ہو کر آج ادھر ہی شب گزاری کی سزا دینے کا ارادہ ہے تمھارا۔''

''میں کیوں ناراض ہوں گی؟'' وہ سنجیدہ تھی۔

''کوئی بات ہوئی ہے؟'' وہ رک گیا۔

''ادھر ہی بیٹھتے ہیں کچھ دیر۔'' وہ جواب دینے یا کمرے کی طرف جانے کی بجائے ڈرائنگ روم میں آئی لیکن پھر وہاں کہیں ٹکنے کی بجائے باہر برآمدے میں آگئی۔

''تم نے کسی ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔'' اس کے بازو میں بیٹھتے ہوئے عِصام نے شکوہ کیا۔

''میں ناراض نہیں ہوں۔ ماجد الگ ہونا چاہتا ہے اور امی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں، چھوڑیں۔ یہ بتائیں آپ کو کیوں لگا میں غصہ ہوں؟''

''تم اب تک خفا نہیں ہو مجھ سے؟'' اس کے سوال پر ندا نے نظریں چرا لیں۔

''آپ مجھے بتا بھی تو نہیں رہے کیوں دانیال کے سامنے ہاں کی تھی؟''

عِصام کچھ دیر چپ سوچتا رہا۔

''تم میرے لیے محض وہی تھی یعنی کچھ دن کے لیے مستعار لی گئی مدد۔ اگر تم مجھے، تمھارا گھر وزٹ کرنے سے پہلے کہیں مل جاتی تو میں پہچان بھی نہیں پاتا۔ جس دن ماہ نور ضد کر کے مجھے تمھارے گھر لائی تھی اس دن میں نے تمھیں پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس دن میں نے تمھیں اتنے غور سے دیکھا کہ اگلی ملاقات میں پہچان سکتا تھا۔ تم گھر آئیں یا میں ماہ نور کو فون لگا کر دیتا، وہ سب روٹین باتیں تھیں، جو زندگی میں ہوتی رہتی ہیں، جن میں یاد رہ جانے والا کچھ نہیں ہوتا۔ پھر ظریفہ آنٹی کے یہاں شادی میں دانیال اینڈ گینگ کی وجہ سے تم میری نظر میں رہیں کہ میں انھیں اچھی طرح جانتا تھا۔ تب تک تمھاری اتنی اہمیت بن گئی تھی کہ ماہ نور تمھاری فین تھی اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔۔۔'' اس نے ماہ نور کا 'ضرورت کیا ہوتی ہے' سوال حذف کر دیا۔

''ماہ نور کی باتوں کی وجہ سے میں بھی تمھیں سوچنے لگا تھا۔ تمھیں یہ بات جھوٹ لگتی ہے لیکن سچ یہ ہی ہے کہ دانیال کے سوال پر ہی میں نے ایمانداری سے سوچا اور۔۔۔'' اس نے ندا کے کیچر سے نکل کر چہرے پر آ رہے بال ذرا پیچھے کیے۔

''مجھے اس چہرے، اس لڑکی کے ہمیشہ اپنے گھر اور زندگی میں رہنے پر کوئی مسئلہ نہیں تھا اور کسی سے شادی کے لیے رضامند ہونے کے لیے اتنا کافی ہوتا ہے کہ ساتھ رہنے دل مان جائے۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔

''اب تو تم بھی کہہ سکتی ہو کہ میرا فیصلہ غلط یا جذباتی نہیں تھا۔۔۔ یا ایسا نہیں ہے؟''

''نہیں۔۔۔''اس نے سر جھکالیااور نظر پیروں پر پڑی تو۔۔۔وہ بات ہی بھول گئی۔

آج اس نے اپنے پیر چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

''نہیں کیا؟''

''یہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔۔۔لیکن پتا نہیں۔۔۔''وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی،عِصام نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی۔

''تمھیں یاد ہے،میں نے کہا تھا سوچو اور اس وقت تک سوچو جب تک ہمارے جواب مل نہیں جاتے۔''

ندا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو ہمارے جواب اب بھی نہیں ملے؟''

''ندا کو پہلی بار ایسی مشکل کا سامنا درپیش تھا کہ وہ جانتی تھی اپنی بات اسے سمجھا نہیں سکے گی۔

''وہ نہیں پتا لیکن اب ساتھ رہنے پر دل کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''یعنی مجھے انتظار کرنا ہے۔''اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ندا نے سر جھکالیا۔

''میں کر سکتا ہوں انتظار۔''عِصام نے ذرا سا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا پھر اس کے پیچھے بازو پھیلا کر خود سے قریب کر لیا۔ذرا توقف کے بعد ندا نے اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔

''میاؤں۔۔۔''دفعتاً گیٹ کے دائیں طرف دیوار پر بیٹھی بلی نے آواز نکالی۔

"تمھیں پتہ ہے یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"اونہوں۔"

"یہ ہمیں کہہ رہی ہے، گیٹ اے روم! (کمرے میں جاؤ)"

وہ زور سے ہنس دی پھر وقت کا احساس ہوتے ہی منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ عِصام مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆

"امی نے بہت کنٹرول کر لیا ہے خود کو۔" رقیہ فون پر اس سے کہہ رہی تھی۔

"اب نہ بڑبڑاتی ہیں نہ کڑھتی ہیں اور ان دونوں کے سامنے تو ایک دم نارمل رہتی ہیں۔ ان کا موڈ دیکھ کر ہی شاید کل بھائی نے امی سے الگ جانے کی بات کی اور امی نے سکون سے کہہ دیا ساتھ رہتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی لیکن تمھاری خوشی اور مرضی الگ رہنا ہے تو شوق سے جاؤ۔"

"واؤ! یقین نہیں آرہا مجھے۔۔۔ امی نے واقعی یہ کہا؟"

"ہاں۔۔۔ بھائی کی شکل دیکھنے لائق تھی۔" رقیہ یاد کر کے ہنس پڑی۔

"اللہ کرے امی ایسے ہی خود کو کنٹرول میں رکھیں۔" اس نے دعا کی۔

"تم بتاؤ، ادھر سب کنٹرول میں ہے میرا مطلب سب ٹھیک ہے؟"

''ہاں سب ٹھیک ہی ہے بس۔۔۔'' وہ رک رک کر کہتے ہوئے رک ہی گئی۔

''ہیں! یہ کیا ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''بس مجھے ہی سمجھ نہیں آتا۔۔۔ کیا اٹک گیا ہے میرے دماغ میں۔''

''تم عِصام بھائی سے ہی سب کچھ کھل کر بول کیوں نہیں دیتی یا جو بھی پریشان کر رہا ہے ان سے ہی پوچھ لو۔''

''یہ کر تو لوں لیکن ڈر لگتا ہے۔''

''کیسا ڈر؟''

''یہ ہی کہ کوئی ایسی ویسی بات سامنے نہ آجائے جو میں۔۔۔''

''ارے یہ ہی ڈر تو سارا جواب ہے۔'' آج کل وہ بڑی سیانی ہو رہی تھی۔

''تم گوڈے گوڈے عِصام بھائی کے عشق۔۔۔ یہ زیادہ ہو گیا۔۔۔ تم گوڈے گوڈے اس گھر کے عشق میں مبتلا ہو، تم وہاں سے نکل ہی نہیں سکتی۔۔۔''

جانے کتنی دیر بعد اس نے فون رکھا تھا۔

''ندا!'' نانی کی آواز پر وہ پلٹی۔

''عِصام نے تم جیسی لڑکی سے شادی کیوں کی۔۔۔ آؤ میں بتاتی ہوں۔'' وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے لگیں۔ وہ ہکا بکا وہیں بیٹھی رہی کہ یہ اتنا اچانک تھا پھر ہوش میں آکر ان کے پیچھے دوڑی۔

☆☆☆☆

تسلیم بیگم کے شوہر اور ان کا سارا خاندان ہی سیٹھ کرامت علی کے پرانے ملازم تھے۔ ان کے شوہر نے اپنے والد کی وفات کے بعد وہاں کام کرنا شروع کیا تھا۔ جب ان کی بھی وفات ہوئی تو ان کی کم عمر بیٹی اور بیوی کو دفتر میں ملازم نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے وہ انھیں اپنے گھر لے آئے۔ وقت کے ساتھ تسلیم بیگم وہاں کی سب سے قابل اعتماد اور سب سے زیادہ اختیارات رکھنے والی ملازمہ بن گئیں جو خود کو اس خاندان کا حصہ سمجھ کر اپنی ذمہ داریوں کو فرائض کی طرح پورا کرتی تھیں لیکن ان کی اکلوتی بیٹی، صباحت ذرا مختلف فطرت لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اتنے بڑے خاندان اور گھر میں انھیں اپنی بیٹی کی خاص فکر نہیں تھی۔ انھیں لگتا ایک محفوظ چھت مل گئی تھی اور وہ اسکول جاتی تھی، اتنا کافی تھا۔ وقت آنے پر اپنے جیسے لوگوں میں اس کی شادی ہو جائے گی۔ صباحت نے ہمیشہ آس پاس پیسے کی ریل پیل، سہولیات اور مراعات دیکھی تھیں۔ دوسروں کے لیے ان کی بہتات اور اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر وہ اس ناانصافی پر اول اول کڑھتی رہتی مگر اس نے کڑھ کڑھ کر جلنے اور ترس ترس کر زندگی گزارنے کی بجائے نہ صرف آس پاس جیسی زندگی کی خواہش کی بلکہ انھیں پورا بھی کرنے لگی۔ اس نے ترس، حسرت اور محرومیوں کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ وہ من چاہا حاصل کرنے کے سارے ہیر پھیر خود ہی سیکھ گئی تھی۔ گھر کی کسی لڑکی کی کوئی چیز پسند آجائے بس پھر وہ

سارے حربے، پینترے استعمال کر کے اسے حاصل کر لیتی۔ کبھی اس نے ہاتھ پھیلایا نہ منہ سے مانگا بلکہ وہ یوں کرتی کہ اس چیز کی مالکن خود ہی وہ اسے تھما دیتی۔ کبھی کسی کو کوئی شئے زیادہ ہی پسند ہوتی تو نا جانے کہاں سے اس میں وہ نقص پیدا ہو جاتا کہ مالکن کا دل ہی اٹھ جاتا اور وہ صباحت کو دے دیا جاتا۔ کہیں جانا ہو، کچھ کھانا ہو، کوئی کام نہ کرنا ہو، کچھ حاصل کرنا ہو۔۔۔ وہ سب کچھ اپنی زبان اور چالاکی سے کر لیتی تھی۔ وہ کوشش سے گھر کی سبھی لڑکیوں کی چہیتی بن گئی تھی، سب کی سہیلی بھی تھی۔ ان کے آگے پیچھے پھرنا، ان کے کام نمٹانا، ان کی تعریفیں کرنا، وہ سب کچھ کرتی جو اسے ان کی 'گڈ بک' میں بنائے رکھتا۔ سارے گھر میں اس کا نام گونجتا رہتا، ہر کسی کو کام کے لیے وہ یاد آتی، ہر کوئی ذمہ داری سونپنے کے لیے اس پر بھروسا کرتا۔ اس نے اپنی حیثیت دیکھ کر خوابوں کو آنکھوں سے دور نہیں رکھا تھا بلکہ وہ ہر خواب کی تعبیر پانے کے لیے جنونی تھی۔

بیٹی کا گونجتا نام سن کر تسلیم بیگم مارے خوشی کے پھول جاتیں کہ ان کی بیٹی کس قدر اپنے کام سے مخلص اور ہر دل عزیز ہے۔ گھر کے دوسرے ملازم اس سے خار کھاتے تھے

گھر کی لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں پھر بیٹوں کی۔ صباحت کے لیے بھی رشتے آئے مگر اسے کوئی پسند نہ آتا۔

گھر کے سب سے چھوٹے بیٹے، طاہر علی کی دو بیٹیاں تھیں۔ تیسری دفعہ ان کی بیوی امید سے تھی۔ سب کو بیٹے کی خواہش اور انتظار تھا لیکن وہ اور بچہ دونوں وضع حمل کے دوران وفات پا گئے۔ ان کی بیٹیاں کنزہ اور منزہ زیادہ بڑی نہیں تھیں اور گھر میں ان کی دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں لیکن وہ اتنی جلدی دوسری شادی کے لیے تیار نہیں تھے۔ صباحت نے دونوں بیٹیوں کے سارے کام سنبھال لیے۔ وہ الف سے ے تک ان کا ہر کام خود کرنے لگی۔ بچیاں بھی جلد اس کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ اسے ہی ڈھونڈتیں، اسے ہی پکارتیں۔ ڈیڑھ سال کے وقفے میں گویا صباحت ان بچیوں کی ماں ہی بن گئی تھی۔ گھر والے اور طاہر علی سب اس کے مشکور اور اس سے خوش تھے۔

خاندان کی ایک تقریب کے دوران جب گھر مہمانوں سے بھرا تھا، ایک دھماکا ہوا۔ ملازم طاہر علی کی خواب گاہ میں گیا جہاں بستر پر صباحت لیٹی تھی اور وہ خود غسل خانے میں تھے۔ ملازم خاموشی سے چلا بھی جاتا مگر اسی وقت صباحت جاگ گئی اور ملازم کو دیکھ کر خود ہی گڑبڑا کر رونے لگی، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگی کہ کسی کو نہ بتائے وہ کنزہ کی ضد پر اسے اس کمرے میں لائی تھی کہ اسے یہاں سونا ہے۔ وہ اس کے ساتھ لیٹی اسے سلا رہی تھی کہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ اب کنزہ جانے کہاں تھی اور وہ یوں غلط وقت پر پکڑی گئی تھی۔ شور سن کر طاہر علی بھی باہر آئے اور پھر ایک آسانی سے دب جانے والی بات اسکینڈل بن گئی۔ سارے گھر میں بات پھیل گئی صباحت رو

روا تنی ہلکان ہو جاتی کہ بے ہوش ہو جاتی۔ وہ خود ہی ہر کسی کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ ایسا کچھ نہیں جیسا وہ سمجھ رہے ہیں، کنزہ کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی ثبوت نہیں، کیا اب اسے بچیوں کی دیکھ بھال سے روک دیا جائے گا، وہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سارے سوال کر کے وہ پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتی۔ بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے۔ اتنی ہی باتیں بھی ہونے لگیں۔ کچھ کو طاہر علی مشکوک لگتے، کچھ کو دونوں اور چند کو دونوں بے گناہ لگتے۔

مہمانوں میں موجود کسی جہاں دیدہ بزرگ نے کہا، بدنامی سے بچنے اور بچیوں کی زندگی سنوارنے کی خاطر ان دونوں کی شادی کر دی جائے اور پھر یہ بات سرگوشیوں میں پھیل گئی۔ لوگ اعتراض کرتے، انگشت بدنداں رہ جاتے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کسی کو عمروں کا فرق دکھائی دیتا کسی کو حیثیت کا۔ زیادہ تر کے نزدیک ان کے طبقاتی فرق کے باوجود 'اس طرح' کا تعلق تو قائم ہو سکتا تھا لیکن شادی نہیں ہو سکتی تھی آخر وہ نوکرانی تھی۔ لیکن یہ مسلم سچ تھا کہ طاہر علی کو بیوی کی ضرورت تھی اور بچیوں کو ماں کی۔

گھر میں لگی عدالت میں کچھ لوگوں کے کہنے پر صباحت سے اس دن کے واقعات کو تفصیل سے سنا جا رہا تھا۔ کسی مجرم کی طرح اس سے جرح اور سوال ہو رہے تھے۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ اپنی بے گناہی اور پاک بازی کی قسمیں کھا رہی تھی کہ اچانک سب کو حیران کرتے ہوئے صباحت نے طاہر علی کے پیر پکڑ لیے کہ وہ انھیں اس ذلت سے بچانے اس سے شادی کر لیں۔ وہ بچیوں کی دیکھ بھال کرے گی ان سے کچھ نہیں مانگے

گی۔ نوکرانی ہی رہے گی مگر لوگ اس طرح انھیں ذلیل تو نہیں کریں گے۔ دوسرا دھماکا طاہر علی نے کیا کہ وہ صباحت سے شادی کرنے تیار ہے۔

لوگوں نے جو سمجھا وہ کہا بھی مگر یہ شادی ہو گئی۔ تسلیم بیگم کی حیثیت بھی یکایک بدل گئی۔ صباحت نے جلد طاہر علی کا دل بھی جیت لیا۔

کچھ وقت بعد کاروبار الگ ہوئے اور سب نے اپنے گھر بھی الگ کر لیے۔ وہ صباحت کے ساتھ نئے گھر میں آ گئیں۔ ساری عمر ان پر ذمہ داریوں اور کام کا بوجھ رہا تھا اس لیے فارغ ہوتے ہی انھوں نے اللہ سے لو لگالی۔ زیادہ وقت کمرے میں نماز روزے میں گزارتیں۔ انھیں یقین تھا گھر، بچے شوہر سب کو صباحت بخوبی سنبھال لے گی۔

نئے گھر میں اللہ نے صباحت کو بیٹے سے بھی نواز دیا اور اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اس نے خود کو بدل لیا۔ اب وہ کسی خاندانی، پیدائشی امیر عورت سے کم نہیں لگتی تھی۔ شوہر کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ کم عمر بیوی کے غلام ہو کر اپنی بیٹیوں سے لاپرواہو گئے ہیں۔ انھوں نے بچیوں کے معاملے میں آنکھ بند کر کے بیوی پر بھروسا کر لیا تھا۔ وہ بیوی جسے ان بچیوں سے کوئی انسیت نہیں تھی نہ ان کی فکر تھی۔

عِصام سمجھدار ہوا تب تک بیٹیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ عِصام اور ان میں ہمیشہ اجنبیت رہی۔ وہ کبھی بہن بھائیوں کی طرح قریب نہیں آ سکے۔ عِصام اسکول کے بعد پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔

پہلے طاہر علی کا انتقال ہوا۔ صباحت نے چاہا کہ عِصام واپس آجائے لیکن تعلیم کے ساتھ وہ اب وہیں بس جانا چاہتا تھا۔

''یہ اتنا سب کچھ تمھارا ہے بیٹا۔ یہ کون دیکھے گا۔ یہ سب تمھیں ہی سنبھالنا ہے۔''

''مجھے بزنس میں انٹرسٹ نہیں ہے ممی۔''

صباحت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو سب کچھ ملے اس کے لیے بہت پاپڑ بیلے تھے اور بیٹا کہہ رہا تھا اسے دلچسپی نہیں۔

''اچھا تمھیں جتنے دن باہر گزارنے ہیں گزار لو پھر تو آنا ہی ہے۔'' اس نے عِصام پر زور زبردستی نہیں کی۔ اسے لگا ابھی عمر ہی ایسی ہے۔ تھوڑی سوچ پختہ ہو گی تو خود ہی بھاگا آئے گا۔ وہ خود ہی معتمد اور پرانے لوگوں پر بھروسا کر کے کام دیکھنے لگیں۔ دامادوں کو دلچسپی تھی مگر صباحت انھیں دور ہی رکھتی تھی۔

وہ واپس آتا یا سمجھ پاتا اس سے پہلے صباحت بھی چلی گئی۔ وہ ماں کی وفات پر آیا تو سب نے سمجھایا اب واپس آجاؤ، یہاں کاروبار ہے، گھر ہے جس کے تم اکلوتے وارث ہو مگر وہ کسی پروجیکٹ کے درمیان تھا۔ اپنا کام وہ دل و جان سے کرتا تھا جو اسے پسند تھا۔ اس نے تمام ملکانہ حقوق اور اختیار اپنے پاس رکھتے ہوئے کاروبار کیئر ٹیکر کے حوالے کر دیا۔ وہ دور سے ہی سارے معاملات پر نظر رکھتا، اس کے فیصلوں میں شامل رہتا۔ کسی کو اس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا لیکن پہلی بار نانی کو احساس ہوا کہ صباحت کا بیٹا ماں سے زیادہ اپنے باپ کے خاندان کی رحم دلی اور خدا ترسی رکھتا ہے۔

''عِصام، صباحت سے بالکل مختلف ہے۔'' تسلیم بیگم نے سوچا تھا اور پھر اس خیال پر خود ہی ٹھٹھک گئیں۔

''کیسے؟ کیا الگ ہے ان میں؟'' اور جو برسوں سے دیکھ، سن رہی تھیں مگر اسے کسی عنوان، کسی نام کے تحت نہیں رکھا تھا، وہ اب بنا کسی کوشش کے ذہن میں کسی شہ سرخی کے ساتھ براجمان تھا۔

''جتنا صباحت کو دولت کا شوق اور جنون تھا اس کا بیٹا اتنا ہی ان سب سے بے نیاز ہے۔

''اگلے خیال پر وہ پہلے خیال سے زیادہ چونکیں۔

''کاش صباحت یہ دیکھ سکتی، جس کے لیے اس نے اتنا کچھ کیا، اسے اس کی تمنا ہی نہیں!

''وہ جانتے بوجھتے انجان بنی ہوئی تھیں کہ صباحت کیا کچھ کر رہی ہے۔ انھوں نے صباحت کی بچیوں کے ساتھ سرد مہری اور سختی دیکھی تھی، جن سے مبینہ محبت اور انسیت شادی کی بنیاد تھی۔

''وہ سمجھ دار ہے، مجھے اس کی گھر داری میں مداخلت کر کے اس کے معاملات بگاڑنے نہیں چاہیے۔'' ایسے موقعوں پر وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتیں۔

انھوں نے اس وقت ہی کنزہ کو الگ لے جا کر پوچھا تھا، آیا وہ صباحت کے ساتھ اپنے پاپا کے کمرے میں سونے گئی تھی یا نہیں۔

''میں کیوں پاپا کے کمرے میں جاؤں گی، میں تو اپنے کمرے میں سوئی تھی۔''

اور اس وقت بیٹی کے مزاج نے انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ جو اس نے سوچا اسے حاصل کرنے وہ اس حد تک جا سکتی تھی تو ماں کے روکنے کا کیا اثر لیتی۔ انھیں لگا کہیں انھیں بھی کسی ایسے ڈرامے کے بعد اپنے گھر سے نکال دیا تو وہ کہاں جائیں گی۔

لیکن اب انھیں سب یاد آتا۔ عِصام کے جانے کے بعد وہ اتنے بڑے بنگلے میں نوکروں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ سویا ضمیر کچوکے لگانے لگا تھا۔ عبادات کرتیں تو اپنا آپ منافق لگتا۔ جس گھر سے نکالے جانے کے خوف سے انھوں نے خود کو گونگا اندھا بہرا بنالیا تھا، وہی گھر اب ماضی کی یادوں، باتوں کا قبرستان بن گیا تھا۔ جہاں ہر قبر سے نکلا بھوت انھیں ڈراتا تھا۔

لیکن اس خاندان کے المیے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ایک دن خبر آئی کہ طاہر علی کی چھوٹی بیٹی کنزہ اور شوہر کار حادثے میں انتقال کر گئے ہیں۔ ان کی بیٹی ساتھ نہیں تھی لہٰذا وہ بچ گئی تھی۔ ان کے یہاں شادی کے کئی سال بعد اولاد ہوئی تھی اور اب وہ بچی یتیم و یسیر تھی۔ تسلیم بیگم جا کر پرسہ دے آئیں۔ بچی اس کے چاچا کے پاس تھی۔ طاہر علی کی بڑی بیٹی ملک سے باہر ہوتی تھی۔

تنہائی اور اکیلے پن کے عذاب کے ساتھ اب انھیں بار بار کنزہ کا خیال آتا رہتا۔ انھیں وہ واقعات یاد آتے جہاں صباحت کی زیادتی دیکھ کر بھی وہ انجان بن گئی تھیں۔ اکثر ڈھائی تین سال کی ماہ نور تصور میں آجاتی۔

''وہ بھی کسی صباحت کے ہتھے چڑھ گئی تو!'' خیال آتا اور ان کا دل اس کے لیے بے قرار ہونے لگتا۔

ایسے ہی ایک دن وہ ماہ نور سے ملنے اس کے چاچا کے گھر گئیں اور وہاں اس پیاری بچی کا حال اور حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ مارے شرمندگی کے وہ زمین میں گڑ گئیں۔ اس حال میں تو کبھی صباحت بھی نہیں رہی تھی۔ ملازموں کے حوالے میلے گندے لباس میں ماہ نور کے بدن سے، اس کے بالوں سے بو آ رہی تھی۔ اس کے چاچا بھی کوئی غریب یا سفید پوش نہیں تھے لیکن پرائی اولاد کا ایسا حال کرنے کے پیچھے کون سا جذبہ ہوتا ہے، وہ اس سے انجان نہیں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ماہ نور کی اگلی ساری زندگی گھوم گئی۔ جو اس زندگی سے بدتر تھی جو کرامت علی کے گھر کے ملازموں کی تھی۔

''نہیں۔۔۔'' ان کا دل دہل گیا۔

ان کی کیفیت سے انجان وہ پیاری بچی انھیں مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

کرامت علی اور ان کا خاندان وہ محسن تھا جنھوں نے اپنے ملازم کی بیوی اور بچی کو بے سہارا نہیں چھوڑا تھا لیکن اب ان کا خون جو بے سہارا بھی نہیں تھا، اسے اس حال میں پہنچانے کا ذمہ دار کون تھا؟

طاہر علی کے بھائی اور بہنیں، سب تو اس خوش فہمی میں تھے کہ ماہ نور اپنے چاچا کے پاس ہے اور اس کے ماں باپ نے اس کے لیے کافی کچھ چھوڑا بھی تھا۔

چاچا دنیا کے سامنے اچھے بنے ہوئے تھے۔ یہ تو تسلیم بیگم کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے ملازمہ اسے ایسے ہی اٹھا کر ان سے ملانے لے آئی تھی۔

تسلیم بیگم ساری رات جاگتی رہیں۔ وہ مرنے سے پہلے جو ٹھیک کر سکتی تھیں، اسے سدھارنا چاہتی تھیں۔ صباحت کے ساتھ جو خاموشی انھوں نے اپنا وطیرہ بنالی تھی، وہ وہی دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔ انھیں توبہ کا ایک موقع ملا تھا اور اگلی صبح انھوں نے عِصام کو فون کیا۔

''میں تمھیں تمھاری ماں کا سچ بتانا چاہتی ہوں۔ ایک بار سن لو پھر کبھی واپس نہ آنا چاہو تو مت آنا۔''

اور وہ اگلے ہفتے ہی آ گیا۔ انھوں نے بڑی بے رحمی سے، دل کڑا کر کے اپنی ندامت کے باوجود صباحت کی زندگی شروع سے آخر تک اس کے سامنے کھول کر بیان کر دی، اپنی غفلتوں کے ساتھ۔

''ایک بار تم ماہ نور سے مل لو۔ تم اس کے ماموں ہو، وہ بچی تمھاری بھی ذمہ داری ہے۔ کرامت علی اور طاہر علی نے جو نیکی ہم ماں بیٹی کے ساتھ کی تھی وہی نیکی اللہ کے واسطے تم ماہ نور کے ساتھ کر لو۔ میرا دل نہیں مانتا ہم اسے اس چاچا کے پاس چھوڑ دیں۔ ''

نانی نے اس کی ماں کا بت توڑ ڈالا تھا۔ بے یقینی اور دکھ کے ساتھ ماں کی محبت نے مل کر اس سچائی کو مشکل ترین بنا دیا تھا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اپنوں کے بدصورت اور کریہہ رویے جان کر ہمیں ان سے نفرت ہو جاتی ہے بلکہ اس کے بعد ان کی محبت ہمارا امتحان

بن جاتی ہے جو سب جان کر بھی دل سے نہیں نکلتی۔ سچ اور حق ہمیشہ اپنے ساتھ آزادی نہیں لاتے۔ کبھی کبھی ان کا اظہار اور علم قید بن جاتا ہے۔

ابھی اس کے پاس وقت تھا، موقع تھا۔ صباحت کے برعکس وہ فطرتاً نرم دل اور ہمدرد تھا۔ جب اس نے اپنی سوچ کے بدلے آئینے میں ماں کو دیکھا تو کئی تصویریں واضح ہوتی گئیں۔ اچانک اسے بہت بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ ماں کی زندگی تو تھی ہی ساتھ، باپ کی لاعلمی، اپنی غفلت کا، دونوں بہنوں کی محرومیوں کا، اپنی لاپروائی کا۔۔۔ یہ نہ ختم ہونے والی فہرست تھی۔

ماہ نور سے قبل اتنے چھوٹے بچے اس نے دور سے دیکھے تھے۔ جب وہ اس سے ملا تو ماہ نور صرف اس کی سوتیلی بہن کی اولاد نہیں تھی۔ اس ملاقات پر ان کی ماؤں کے تعلق کا سایہ تھا۔ جس سے وہ باخبر تھا اور انجان ماہ نور اپنے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے والدین کے علاوہ کبھی کسی کے ساتھ خون کی کشش محسوس نہیں کی تھی جو اب اسے ماہ نور میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر خوش تھی، مسکرا رہی تھی۔ عصام کو لگا گویا وہ اسے تسلی دے رہی ہے۔ اس نے جیسے اپنے معصوم تبسم اور چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اسے سنبھال لیا ہو۔ اس نے ماہ نور کو گلے لگایا تو ایک نئی خوشبو سے متعارف ہوا اور پھر یہ خوشبو اس کی زندگی کا سب سے بڑا انعام بن گئی۔

"یہ ہمارے ساتھ رہے گی نانی!" زندگی بدل دینے والا فیصلہ منٹوں میں ہو گیا۔

وہ کسی کا ذمہ دار نہیں تھا۔ نہ ماں کے ماضی کا، نہ اس کی فطرت کا، نہ اس کی رواں رکھی گئیں ناانصافیوں نہ چالوں چالاکیوں کا مگر اسے خود پر ان اعمال کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور پھر دھیرے دھیرے اسے بھی پتا نہیں چلا کب ماہ نور اس کی نجات دہندہ بن گئی۔

ماہ نور کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اس نے ماہ نور کے والد کا کاروبار پوری طرح اس کے چاچا کو دے دیا صرف ان کا مکان رکھا۔ جب وہ وہاں گئے تو اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں ماہ نور نے کہا تھا۔

''یاں رہنا۔۔۔ میں۔۔۔ گھر۔۔۔'' اور اس نے بنگلہ چھوڑ کر نسبتاً اس چھوٹے سے مکان کو اپنا گھر بنالیا۔

اس کے بعد تسلیم بیگم نے کرامت علی کے خاندان والوں سے رابطے بحال کیے۔

انھوں نے مکمل تعلق ختم تو کبھی نہیں کیے تھے مگر اب وہ پابندی سے سب سے ملنے ملانے لگی تھیں۔ ماہ نور کی خالہ سے بھی اس کی بات کروانے لگیں۔

لاکھ کوشش کے بعد بھی وہ خود کو شادی کے لیے تیار نہیں کر سکا تھا۔ اسے ماہ نور کے لیے ایک اور صباحت سے اتنا ڈر لگتا تھا۔ نانی اسے ہر طرح سمجھا کر ہار مان چکی تھیں۔

☆☆☆☆

''اس دن جو اسے تم میں نظر آیا، شاید عِصام وہ سب اپنی ماں میں دیکھنا چاہتا تھا یا اس وقت سامنے اسے تم نہیں خوددار، نڈر، اپنا مقام جاننے والی، کردار کی مضبوط اپنی ماں نظر آرہی تھی، وہ ماں جو فریب تھی، اس کی سمجھ کا دھوکا! ماں کا بت تو ٹوٹ گیا تھا مگر وہ تمھیں بچانا چاہتا تھا۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید تمھیں ساری عمر اپنے ساتھ رکھ کر وہ اپنی ماں کے اس نیک تصور کو اپنے قریب رکھنا چاہتا ہو، کیا پتا اس نے ماں کے لیے امڈ آئی نفرت اور ملال کو تمھاری موجودگی، تمھارے ہونے کے احساس سے کم کرنے کا سوچا ہو یا پھر ماہ نور اور تمھاری ایک دوسرے سے انسیت نے اسے مجبور کیا ہو کیوں کہ صباحت نے جو سلوک ماہ نور کی ماں سے کیا، عصام، ماہ نور کے ساتھ وہی ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وجہ جو بھی تھی اس کی بنیاد تمھاری فطرت اور مزاج تھا جو اسے اچھا لگا۔۔۔''

وہ بولتے بولتے تھک گئی تھیں۔

''وہ کبھی تم پر توجہ نہ دیتا اگر اسے میں نے صباحت کا سچ نہ بتایا ہوتا۔ جب جب میری یا ماہ نور کی بیماری کی وجہ سے گھر کی روٹین متاثر ہوئی، میں چاہتی تھی تمھیں یا تمھاری بہن کو بلالوں مگر وہ منع کر دیتا۔ پہلی دفعہ اتنے دن کے لیے ہمیں چھوڑ کر جا رہا تھا اس لیے کسی مددگار کی موجودگی ضروری سمجھی ورنہ روپا کے علاوہ وہ کل وقتی یا دوسری ملازمہ کے لیے کبھی تیار نہ ہوا جس کی اس گھر کو واقعی ضرورت تھی۔'' وہ اب بھی ساکت بیٹھی تھی۔

''تمھارے جانے کے بعد ماہ نور تمھیں بہت یاد کرتی تھی، مجھے بھی سہولت اور بے فکری ہو گئی تھی۔۔۔ میں نے اسے سمجھایا، کہا تمھیں واپس بلا لیتے ہیں، میں سعدیہ سے بات کرتی ہوں لیکن اس کا فیصلہ نہ بدلا۔ سب میچ ہو رہا ہے، ہمیں نہیں ضرورت، وہ یہ ہی سب کہتا رہا تھا۔'' نانی نے اسے دیکھا۔

''تم ان باتوں کو دل سے مت لگاؤ اور اس وجہ سے اسے غلط، مطلبی مت سمجھو۔ وہ بھی سمجھتا ہے کہ ان حالات میں گھری ہر لڑکی نہ تو صباحت ہوتی ہے نہ ہر لڑکی ندا۔ سب کی اپنی کہانی، اپنی خواہشیں، حدیں اور اصول ہوتے ہیں۔ خودداری اور بد دیانتی کسی طبقے کے نہیں انسانوں کے وصف ہیں۔''

نانی گہرا سانس لے کر پیچھے ٹک گئیں۔

''اس نے سچ جاننے کے بعد اپنی ماں کے بارے میں کبھی کھل کر بات نہیں کی۔۔۔ شاید کبھی تم سے کر لے۔'' انھوں نے دیوار پر گھڑی دیکھی۔

''جاؤ بہت دیر ہو گئی ہے۔'' وہ بھی چونکی کہ بہت وقت ہو گیا تھا۔

''آپ سوچیں مت آرام کریں۔'' وہ کھڑی ہوئی۔

''عِصام اور ماہ نور کی فکر نہ کریں نانی۔'' اس نے آخر دھیرے سے کہا۔

''ہوں۔'' نانی نے آنسو پونچھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔

وہ سست سی کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئی۔

''کہاں رہ گئی تھیں؟ میں ابھی آ ہی رہا تھا۔۔۔''

''عِصام!''اس نے دروازہ بند کیااور دونوں ہاتھ پیچھے دروازے پر رکھ کے دروازے سے ٹک گئی۔وہ اپنانام سن کر ہی خوشی سے جہاں تھاوہیں رک گیا۔

''سوری، بنااگر مگر والی واجب الادا سوری!'' محض سوری نہیں،اس کی آواز میں بھی کچھ تھا جس نے عِصام کی آواز سلب کرلی۔وہ بولناچاہ رہا تھا لیکن نہ ہونٹ جداہوئے نہ زبان ہلی اور وہ اس کی کیفیت دیکھ کر آگے بڑھنا بھول گئی۔

''تو ہمارے جواب ایک ہوگئے ہیں؟''وہ دروازے کے پاس آیا۔

''وہ ایک ہوئے تب ہی تو۔۔۔بات یہاں تک پہنچی ہے۔''

''نہیں۔تم نے کسی وجہ سے کمپرومائز کیا تھا لیکن اب دل مان گیا ہے۔۔۔یہ ہی نا؟''وہ چپ رہی۔

''امی مان گئی تھیں،خوش تھیں تو مجھے انکار پر اڑے رہنا اچھا نہیں لگا۔''

''اور اب؟''

''مجھے نانی نے سب بتادیا ہے۔''اس نے دھیرے سے کہا۔

وہ واضح طور پر چونکا تھا۔اس نے فوراً کچھ کہا بھی نہیں۔

''آپ اس بات پر ان سے ناراض نہ ہوں،وہ۔۔۔''

''نہیں،میں ناراض نہیں ہوں۔''اس نے بات مکمل ہونے سے پہلے یقین دلایا۔

''اچھا ہی کیا۔''ندا کو اس کے تاثرات کی تبدیلی اتنی محسوس ہوئی کہ افسوس نے گھیر لیا۔کیا ضرورت تھی ابھی یہ کہنے کی۔

''آپ نہیں چاہتے تھے مجھے یہ معلوم ہو۔۔۔ تو یقین کریں میں ابھی سب بھول جاؤں گی۔'' وہ اداسی سے مسکرایا۔

''میں تو تمھیں بتانا چاہتا تھا۔۔۔ ہم الگ نہیں، میں بھی ملازمہ کا بیٹا ہوں۔''

ندامان چکی تھی جو جو دادی نے کہا تھا کہ اس وجہ سے اس نے ہاں کی ہوں گی، وہی سچ ہے مگر اب عصام کی بات۔۔۔ بالکل نئی تھی۔

''تمھیں اس دن میری ہاں کی وجہ نہیں سمجھ آئی تھی۔۔۔ تمھیں وہ جاننا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ اب تک دروازے سے ٹکی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں جاننا۔'' جو بات اس کے لیے تکلیف دہ تھی، وہ اسے نہیں چھیڑنا چاہتی تھی۔

''وہ سوری ادھار تھی۔۔۔ بس وہی کہنا تھی۔'' وہ دروازے سے دور ہوئی۔

''اور۔۔۔؟'' عصام نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ وہ واپس پٹ سے ٹک گئی۔

''اور۔۔۔ اور آپ کو پتہ ہو گا اس سوری کا کیا کرنا ہے۔''

''سوری چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ تمھارا کیا کرنا ہے؟'' اس نے دوسرا ہاتھ بھی دروازے پر رکھا۔

جھٹ سے جو جواب ذہن میں آیا اس پر اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر ہنسی روکی۔

"کارٹ بلانچ!" وہ بول کر اس کے بازو کے نیچے سے نکل گئی۔ اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے عِصام کا قہقہہ بلند تھا۔

☆☆☆☆

ماہ نور کے ساتھ ان دونوں کو بے تکلفی اور بے فکری سے ہنستے مسکراتے دیکھ کر نانی مطمئن ہو گئی تھیں۔ ماہ نور کی خالہ پہلی بار اپنے بچوں کے ساتھ کچھ دن ان کے ساتھ رہنے آئی تھیں۔

رقیہ باقاعدہ کالج جانے لگی تھی۔ وہ نئے نئے کورسز بھی کر رہی تھی۔ ندا کوشش کر رہی تھی اپنے گھر کے قریب ہی انھیں کرایے کا مکان مل جائے۔

ماجد ماں سے ملنے آتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی فرحین بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ رقیہ کو لگتا تھا کہ وہ دوبارہ ساتھ میں رہنا چاہتے ہیں کیونکہ اکیلے رہنے کے اخراجات ان کی امید سے زیادہ تھے۔ سعدیہ نے اس دفعہ سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔

"انھیں آنا ہے تو آئیں لیکن میں اپنے منہ سے نہیں کہوں گی کہ آجاؤ ورنہ بعد میں دونوں مجھے اکڑ دکھاتے پھریں گے کہ میرے کہنے پر آئے ہیں۔"

اسے عِصام نے نہیں بتایا لیکن نانی نے اطلاع دی کہ دانیال پر کسی لڑکی نے جنسی ہراسانی کا مقدمہ کر دیا ہے۔

وہ ماہ نور کو سلانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہ صوفے پر لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔ وہ اسے مخاطب کیے بنا باورچی خانے میں آگئی۔ کافی بنا کر لے آئی تب تک بھی وہ فارغ نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک مگ اس کے آگے رکھا اور خود اپنا مگ لیے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اس کی نظر عِصام کے پیروں پر پڑی اور عادتاً دوسری نظر میں اس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ اس کی سہولت بھری زندگی اور آرام دہ گھر کی نشانی اس کے پیروں کی تبدیلی تھی۔ اب وہ پہلے سے کھردرے اور میلے نہیں تھے۔ اس نے پیر چھپانا بہت دن پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ اب وہ عِصام کے پیروں کو بھی لحاف سے ڈھانکتی نہیں تھی۔ وہ کبھی خود اس الجھن کو مکمل سمجھ نہیں سکی تھی جو اسے ان پیروں کا تضاد دیکھ کر ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ہم یونہی کسی بے جان، غیر اہم اور معمولی بات کو کسی خاص احساس سے جوڑ کر ذہنی کسوٹی بنا لیتے ہیں اور پھر ایک نظر نہ آنے والے ترازو کو متوازن رکھنے میں خوار ہوتے ہیں۔

اس نے دیکھا ہی نہیں اس کی محویت اور نظروں کا مرکز دیکھ کر عِصام لیپ ٹاپ بند کر کے اس کے پاس کھسک آیا ہے۔ جب اس نے ہاتھ سے مگ لیا تو وہ چونکی۔

"آج ان پیروں کی مسٹری بتا دو۔"

"یہ ایسی مسٹری ہے جو آج تک مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔"

"لیکن مسٹری ہے؟"

"تھی۔" کچھ چیزوں کا وجود محض ہماری قبولیت یا انکار کا محتاج ہوتا ہے۔

''اگر میں تمھیں اس وقت اپنے فیصلے کی ایگزیکٹ وجہ بتانا چاہوں تو۔۔۔وہ بھی شاید ایسی ہی مسٹری ہے۔''عصام نے اس کی سیاہ چوڑی کو چھیڑا۔

''میں کچھ پن پوائنٹ نہیں کر سکوں گا۔۔۔کوئی ایک ریزن نہیں بتا سکوں گا۔میری ہاں کے پیچھے بھی کئی مکمل کہانیاں تھیں۔صباحت اور تسلیم بیگم کی کہانی، کنزہ اور منزہ کی کہانی، طاہر علی اور ماہ نور کی کہانی۔۔۔ایک کہانی تمھاری اور میری بھی تھی۔۔۔جو اس وقت بڑی مختصر تھی مگر سب سے سچی اور خالص بھی۔''

''میں نہیں سوچتی ہوں عصام، پہلے غصے میں تھی اس لیے جاننا تھا۔آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ یہ کوئی الجھن یا خلش ہے میری۔''

''اوکے۔''اس نے مسکرا کے اسے قریب کیا۔

''میں آپ کو کچھ بتانے آئی تھی۔۔۔''اس نے بولتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''ابھی آئی۔''وہ یونہی منہ پر ہاتھ رکھے اٹھ کر بھاگی۔

عصام کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے پیچھے جانے اٹھا ہی تھا کہ جہاں ندا بیٹھی تھی اس کے پیچھے نظر پڑی اور اس نے جھک کر سفید پلاسٹک کی ٹیسٹ کیسٹ اٹھائی اور حیرت سے دروازے کو دیکھا جدھر ندا بھاگی تھی۔

''ندا! یہ کوئی وقت ہے بتانے کا؟''وہ اسی وقت منہ پونچھتی غسل خانے سے نکلی تھی۔

''میں اس وقت چیخ چلا کر ساری دنیا کو سنانا چاہتا ہوں مگر ماہ نور اور نانی سو رہی ہیں۔'' وہ اس کی طرف بڑھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے دروازے کی طرف آئی اور پٹ بند کر دیے۔

''چیخیں، چلائیں۔۔۔'' اس نے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس سے زیادہ خوش تھی۔

عصام نے ہاتھ میں پکڑا ٹیسٹ کیسٹ نائٹ اسٹینڈ پر اچھالا جس میں دو سرخ لائن بڑی واضح تھیں، اور پاس آ کر اس کے ہاتھ کان سے ہٹائے۔

''ساتھ میں دنیا کو بتاتے، سب کو جگاتے ہیں۔۔۔ون ٹو تھری۔۔۔''

ختم شد



ARK